ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

اکتوبر ۲۰۱۷ء

www.nadwifoundationaligarh.org

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	جب فسق وفجور غالب آجائے.....	حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ	
۲۔	اداریہ	قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم	مدیر	۳
		ڈیرا سچا سودا کی کہانی اور ایک نیا زاویۂ نظر		۱۴
۳۔	پیام سیرت	رنگ لاتی ہے حنا، پتھر پہ گھس جانے کے بعد!	محمد فرید حبیب ندوی	۱۳
۴۔	ماحولیات	ماحولیات کا تحفظ اسلام کی نظر میں	محمد قمر الزماں ندوی	۲۴
۵۔	سال نو	نئے ہجری سنہ کا آغاز	مولانا ابوالکلام آزاد	۳۲
۶۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴۸
۷۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام- ایک مطالعہ (قسط-۱۹)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۵۱
۸۔	انکار حدیث	فتنۂ وضع حدیث کے اسباب	محمد فرید حبیب ندوی	۵۴
۹۔	عالم اسلام	ایک اہم دستاویز	ترجمہ: محمد عالم ندوی	۶۰
۱۰۔	تعارف و تبصرہ	نقوش سیرت	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۶۲
۱۱۔	آخری صفحہ	یہی انسان کی فلاح کا ضامن ہے	م۔ق۔ن	۶۴
۱۲۔	شعر وادب	مرحلۂ غم کا ہے مشکل، مگر آساں ہوگا	ماہر القادریؒ	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

(برما سے سعودیہ تک)

برما جو اب میانمار کہلاتا ہے، کسی زمانے میں اس کی وہی حیثیت تھی جو اب خلیج کی ہے، اس کا ایک صوبہ اراکان ہے جس کو رخائن کہا جاتا ہے، وہاں روہنگیا مسلمان تقریباً ۴ فیصد آباد ہیں، جن کی کل آبادی تقریباً ۲۰ لاکھ ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو عرصۂ دراز سے ستائے ہوئے لوگ ہیں، جنہوں نے بڑے بھیانک قسم کے نسلی تشدد کا سامنا کیا ہے، ۱۹۸۲ء میں نافذ کیے گئے شہریت کے نئے قانون Citizenship Act نے تو ان کی کمر ہی توڑ کر رکھ دی، شاید ہی کوئی صبح ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلی ہو اور کسی شام انھوں نے چین کی نیند لی ہو، کسی دن انھوں نے آسودہ ہو کر کھایا ہے، ان کو شادی کرنے کے لئے بھی حکومت کی اجازت کی ضرورت، بچے پیدا کرنے میں بھی وہ قانون کے پابند، انھیں اپنی حدود اربعہ سے نکلنے کی کوئی اجازت نہیں، ان پر الزام ہے کہ وہ نسلاً برمی نہیں بلکہ بنگالی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جس علاقے میں آباد ہیں اس کی سرحدیں بنگلہ دیش سے ملتی ہیں اور روہنگیا مسلمانوں کا ایک طبقہ تہذیبی اور لسانی طور پر بنگلہ زبان و کلچر سے وابستہ ہے، لیکن تحقیق کے مطابق ان کی اکثریت کئی صدیوں سے وہاں آباد ہے۔

ان تمام غیر انسانی پابندیوں اور وحشیانہ سلوک کے باوجود کسی نہ کسی طرح یہ لوگ وہاں زندگی گزار رہے تھے، ۲۰۱۲ء میں اچانک وہاں فساد پھوٹ پڑا، جس کا سبب زنا بالجبر کا ایک واقعہ بتایا جاتا ہے، خدا معلوم کہ اس واقعہ میں کس حد تک سچائی تھی، لیکن اس کے بعد بے بس لوگوں پر جو قہر ٹوٹا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے، فسادات کی یہ آگ دراصل نسلی تشدد اور سیاسی مفادات کے سبب بھڑکائی گئی جس نے آگے چل کر مذہبی تشدد کا رنگ اختیار کر لیا، سوشل میڈیا پر معتبر ذرائع سے جو رپورٹ اور تصاویر و ویڈیوز آئی ہیں انھیں دیکھ کر بے حس کا کلیجہ بھی منہ کو آتا ہے، یہ الگ بات کہ پاکستان کے کچھ چندہ مافیاؤں نے ان مظلوموں کی مظلومیت پر بھی ترس نہیں کھایا اور جعلی تصاویر و ویڈیوز بھی خوب اپ لوڈ کیا، جس سے بے چارے روہنگیا مسلمانوں کو ہی نقصان ہوا، خوف و ہراس کے عالم میں جینے والے ان مظلوموں کے لیے گویا عرصۂ حیات تنگ ہے، اراکان کی سرزمین ان کے لیے وادیٔ جہنم بن چکی ہے، زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ کر دی گئی ہے، ہجرت کے راستے بھی ان پر مسدود ہیں، پھر جان بچا کر بھاگنے والوں میں سے کچھ لوگ جن کی تعداد چالیس ہزار بتائی جاتی ہے ہندوستان میں پناہ گزین ہیں، تقریباً تین لاکھ کی تعداد بنگلہ دیش کے سرحدی علاقہ میں کسی مپرسی کے حال میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے، کچھ لوگ انڈونیشیا ہجرت کر گئے ہیں، ایک بڑی تعداد کشتیوں کے ذریعہ ہجرت کے دوران اپنی جانیں سمندر کی نذر کر چکی ہے، ہزاروں کی تعداد میں مرد، عورت، بوڑھے اور بچے موت کی نیند

سلا دئے گئے ہیں، جنھیں مارا گیا ہے، انھیں صرف مارا نہیں گیا ہے، بلکہ تڑپا تڑپا کر مارا گیا ہے، چھوٹے چھوٹے بچوں کو تڑپا تڑپا کر قتل کیا گیا ہے، پوری پوری بستیاں آگ لگا کر خاک میں ملادی گئی ہیں، اذیت دینے کا ہر حربہ آزمایا گیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ارا کان کی یہ یورش روہنگیا مسلمانوں کی نسل کشی Genocide کے لیے برپا کی گئی ہے، اب تو چوطرفہ یہی بات کہی جارہی ہے، آج ۱۶ ستمبر کے اخبار میں بعض عالمی تنظیموں نے بڑے پیمانے پر روہنگیا خواتین کی عصمت دری پر حیرت کا اظہار کیا ہے، وہاں قتل عام کی ایسی وارداتیں انجام دی گئی ہیں کہ بعض اہل قلم ان وارداتوں کو دیکھ کر سورۂ بروج میں ذکر کیے گئے "اصحاب الاخدود" کے واقعہ کو ان پر منطبق کرنے لگے، قرآن میں مذکور اصحاب اخدود کا واقعہ دور وحشت میں انجام پایا مگر یہ تو دور ترقی ہے پھر بھی دنیا کی مہذب قومیں اس وحشت و بربریت پر خاموش تماشائی ہیں۔

ایسا لگتا ہے جیسے گوتم بودھ کے پیروکاروں نے اپنا مذہبی نظریہ ہی بدل دیا، جہاں جنگ وجدال کی گنجائش ہی نہیں تھی اور جن کے یہاں دنیا بیزاری مذہبی امتیاز تھا، ان کے منہ کو خون ایسا لگا کہ ان کو ٹارچر کرنے، درد سے اٹھنے والی ٹیسوں اور عضو عضو کاٹ کر تڑپانے میں مزا آنے لگا، اس کے پیچھے مذہبی جنون ہے جس نے ان کو اس حد تک پہنچا دیا ہے، درحقیقت انھیں اسلام سے خوف ہوا، پھر ان کو ایک راہب آشن ورا تھو نے اکسایا اور اس حد تک اکسایا کہ فوج اور بدھ مت کا نام لینے والے آدم خور بھیڑیوں نے انسانیت کو شرمسار کردیا اور ظلم کی تمام حدیں پار کردیں، روہنگیا مسلمانوں کا مسئلہ کب سے چل رہا ہے؟ اصل مسئلہ کیا ہے؟ ظلم اس قدر کیوں کیا گیا؟ حکومت کی سرپرستی، فوج کی بربریت اور عوام کی ظالمانہ کاروائی سب ایک ہی رجحان کی پابند کیوں ہوگئی؟ یہ اور ایسے متعدد سوالات ہیں جن کے جواب میں بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں، یہاں ان تفصیلات سے قطع نظر بعض دوسرے اہم پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

۲۰۱۲ء میں جب روہنگیا مسلمانوں پر ظلم وتشدد شروع ہوا تو بھی عالمی منظر نامے پر خاموشی نظر آئی، ۲۵ اگست ۲۰۱۷ء کو جب دوبارہ تشدد کا سلسلہ شروع ہوا تو کچھ اسی طرح کی خاموشی چھائی تھی، مگر پھر کچھ برادران نے پوری قوت کے ساتھ اس مسئلہ کو سوشل میڈیا پر اٹھایا، جس کے نتیجہ میں عالمی پیمانے پر بلاتفریق مذہب وملت علَمِ احتجاج بلند ہونے لگا، برما کی وزیر اعظم کو اپنی خاموشی توڑنا پڑی اور شرمناک سہی مگر اس نے ایک بیان دیا، ادھر غیرت اسلامی سے سرشار قائد ملت رجب طیب اردوغان صاحب نے عالمی ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، انھوں نے عالمی برادری کو بھی اپنے بے باک انداز میں مخاطب کیا اور عرب ومسلم حکومتوں کو بھی بیدار کرنے کی کوشش کی، **مگر صد حیف کہ غفلت کے مارے بے بس عرب حکمراں کیسے جاگیں گے معلوم نہیں**، اردوغان نے ایک ہزار ٹن امدادی سامان بھیجنے کا اعلان کیا، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس مسئلہ کو اٹھانے کا وعدہ کیا، آنگ سانگ سوچی سے فون پر بات کی، ترکی کی امدادی ٹیم کے برما جانے پر گفتگو ہوئی، یہی نہیں بلکہ اپنی بیگم امینہ اردوغان، اپنے صاحبزادے اور ترک سماجی تنظیموں کے وفد اور وزیر خارجہ کو بنگلہ دیش بھیجا، بیگم کے وفد میں کچھ ماہرین نفسیات اور اساتذہ بھی موجود تھے جن کو بنگلہ دیش میں روہنگیا مسلمانوں کے کیمپ کے لیے بھیجا گیا ہے، ترک سماجی تنظیموں نے باقاعدہ وہاں اپنے دفاتر قائم کرلیے، ترک وزیر خارجہ نے بنگلہ حکومت کو یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ اپنے ملک کی سرحدوں کو ان بے کسوں کے لیے کھول دے، ان کی کفالت کی ذمہ داری مکمل طور پر ترکی اٹھائے گا

، بنگلہ دیش بھی مہاجرین کے بوجھ کر برداشت نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کی معاشی حالت وہاں کی نکمی حکومتوں کے سبب نہ کبھی مستحکم ہوئی ہے نہ ہونے کی امید ہے، تقریبا تین لاکھ روہنگیا وہاں پہنچ چکے ہیں، ابتدا میں تو انھیں داخل ہونے سے بھی روکا جارہا تھا، مگر ترکی کی یقین دہانی کے بعد یہ مسئلہ کسی حد تک حل ہوا ہے، مجموعی طور پر بنگلہ دیش میں مختلف قسم کے پناہ گزینوں کی تعداد سات لاکھ بتائی جاتی ہے، ترکی کے اقدام و یقین دہانی اور عالمی پیمانے پر ہونے والے احتجاجی مظاہروں کے سبب اقتدار کی بھوکی، خون کی پیاسی ''بنگالی حسینہ'' بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئی کہ جب تک روہنگیا واپس اپنے گھر نہیں چلے جاتے ہم ان کے ساتھ کھڑے ہیں۔

خدا ترکی کے بازوؤں کو مضبوط کرے، دور حاضر میں مواسات و مواخات کی جو مثال ترکی نے قائم کی ہے وہ ہمیں ہماری تاریخ یاد دلاتی ہے، اینہ اردوغان جب ڈھاکہ انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اتریں، بنگلہ دیش حکومت کی طرف سے ان کا استقبال کیا گیا اور ان کو استقبالیہ مشروبات پیش کیے گئے، انھوں نے کہا کہ وہ پانی روہنگیا پناہ گزینوں کے کیمپ میں ہی جا کر پئیں گی، چنانچہ آنسو پونچھنے والوں کا یہ قافلہ وہاں پہنچا، ایک شفیق ماں کی طرح اینہ اردوغان نے بچوں کو گلے لگایا، لٹے پٹے زخمیوں کی مزاج پرسی کی، بے بسی کی تصویر بن جانے والی عفیف عورتوں کو سینے سے لگایا، ظاہر ہیکہ ان بے یار و مددگار اور بے گھر لوگوں کے پاس نہانے دھونے کی سہولیات کہاں جبکہ انھیں تو کھانا پینا تک میسر نہیں، سفر نے پراگندہ کر رکھا تھا، کیمپوں کی ناگفتہ بہ حالت نے ان کی حالت بگاڑ رکھی تھی، گندے کپڑے، میلے کچیلے جسم، وہاں کے رطوبت آمیز موسم کے سبب پسینے کا بھپکا، مگر یہ سب بھول کر ترک خاتون اول ایک ایک عورت کو سینے سے لگا کر اشک سوئی کر رہی تھی اور حوصلہ بڑھا رہی تھی، **ان ہی میں ایک خاتون ذرا پڑھی لکھی تھی، حالات کی ماری تھی مگر اس کی تہذیب اس حالت میں اسے خاتون اول کے قریب جانے سے روک رہی تھی، وہ سوچ رہی تھی کہ ایسی حالت میں وہ کس طرح ان سے بغلگیر ہو، اینہ اردوغان نے بھانپ لیا تو اسے کھینچ کر سینے سے لگایا اور پھر انما المؤمنون اخوة کی تشریح کچھ اس خوبصورت انداز سے کی کہ ''اسلامی اخوت کی خوشبو مشک و عنبر کی خوشبو سے بہتر ہے''، ترکی نے ۲۰۱۲ میں بھی اس طرح کے اقدامات کیے تھے اور اب بھی اس نے مثل المومنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم كالجسد الواحد اذا اشتكىٰ منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمىٰ (مسلم ۶/۶۵۸۶) کی مثال پیش کی ہے،** اس موقع پر ایک سینیر و باخبر اور حالات پر گہری نظر رکھنے والے ندوی فاضل کی چند سطریں یہاں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے، جس کا قصہ یوں ہے کہ ایم ودود ساجد کی ایک تحریر ''خود فریبی کی انتہا'' کے عنوان سے گردش کرتی نظر آئی، جس میں بعض غلط اقدامات پر تنقید تھی، مگر ساتھ ہی اردوغان کا ذکر تضحیک آمیز لہجے میں کیا گیا تھا، میں نے اس پر مختصر تبصرہ ایک حلقہ میں لکھا:

> ''باتیں تو بہت سی درست ہیں مگر مجھے نہیں معلوم کہ اس شخص کو اس شخصیت سے کیوں چڑ ہے جسکے سینے میں ایک مسلمان دل دھڑکتا ہے۔۔۔۔ان کے ایک مضمون میں ترکی میں عربی کے احیاء کی تردید کی گئی تھی اور اس حوالے سے اردوغان پر سخت اور ذلت آمیز تنقید تھی۔۔میں نے اس کا تعاقب بھی کیا تھا۔۔۔۔دیکھیے کس طرح امیر المومنین کہہ کہہ کر طنز و تعریض کے تیر برسا رہا ہے''۔
>
> اس کے جواب میں جناب شکیل احمد اعظمی مقیم بحرین نے یہ سطریں لکھیں جنھیں پڑھ کر آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

''ایوبی صاحب آپ نے میرے بھی دلی احساسات کی ترجمانی کر دی۔نفرت وعداوت اور حقد وحسد سے آلودہ تحریریں خواہ ان میں فصاحت و بلاغت کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے غازہ ملنے اور شیریں بنانے کی کتنی ہی سعی نامراد کر لی جائے بدبو کا بھبھوکا ضرور اٹھتا ہے اور مشام جاں کو زہر آلود کرتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ تحریر اسی قسم کی ہے۔آج کے اس ابتلاء وآزمائش کے دور میں وہی مرد حق جو بزدلوں کی بھیڑ میں واحد نڈر قائد ہے، بے حیائی و بے شرمی کے طوفان میں اسلامی شرم وحیا کا پیکر ہے، حمیت وغیرت کا جہاں فقدان ہے وہاں اس نے حقیقی اسلامی غیرت وحمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے باطل طاقتوں کو تنہا للکارا ہے، جس نے بے حس حکمرانوں کے درمیان سے نکل کر امت مسلمہ کے نہتھے کمزور مظلوم اور بے بس شیوخ وشباب اور کمسن بچوں کی آنکھوں سے آنسو پونچھے ہیں، امت کی مظلوم خواتین ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے سروں پر ہاتھ رکھا۔روہنگیا مظلوموں کا ڈھارس بندھانے کے لئے اپنی بیوی اور بیٹے کو ان کیمپوں میں بھیجا جہاں پر کیچڑ ہے، بدبو ہے، دلخراش مناظر ہیں، کہ ان جگہوں پر سڑے گلے مما لک تک کے ادنی ذمہ داران جانے کے لئے تیار نہیں ہیں وہاں پر آپا امینہ اس طرح اسلامی جذبے سے گئیں کہ دنیا دیکھتی رہ گئی، ایک سراپا شفقت ومحبت ماں بن کر گئیں اور یہ کوئی پہلا اور نرالا واقعہ نہیں ہے ہم بارہا اور متعدد جگہوں پر یہ مناظر دیکھ چکے ہیں۔مگر ہائے رے حاقدوں اور حاسدوں کی کم ظرفی اور ستم ظریفی، بلکہ بے حیائی اور بے شرمی کہ وہی چیز جو قابل تعریف تھی مطعون بن گئی، جو بات سرمایہ افتخار تھی وجہ اہانت وتذلیل بن گئی اور اردوگان کو زہر بھرے انداز میں امیر المومنین اور آپا امینہ کو ان کی بیگم کہا گیا۔ پتہ نہیں کیوں ان بے شرموں کو تکلیف ہے؟ یہ تو امت کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے، انہیں تکلیف ہے کہ سب محو خواب ہیں تو ترکی کا مرد آہن جاگ کیوں رہا ہے؟ یہ مردوں میں زندہ کہاں سے نمودار ہو گیا؟۔آخر اردوگان اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے کب کسی دوسرے قائد یا سربراہ مملکت کا راستہ روکا ہے۔ یہ تنافس کا میدان تو کھلا ہوا ہے اپنے اپنے محبوب قائدین کو آواز دیجئے کہ آئیں اور امیر المومنین کا خطاب جیتیں۔ ہماری بھی آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں کہ کوئی اور مرد مومن بھی قدم بڑھائے ہم چشم براہ ہیں ہم انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے اپنے سروں پر بٹھائیں گے کوئی آئے تو سہی۔ اے اللہ تو رجب طیب اردگان کی حفاظت فرما ان کی بیوی بچوں کو صحت و عافیت عطا فرما اور امت کی جو خدمات یہ خاندان آفتاب و ماہتاب انجام دے رہا ہے اسے قبول فرما اور پوری امت کی طرف سے انہیں بھرپور اجر عطا فرما آمین۔شکیل احمد اعظمی''۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت عالم اسلام میں سے ترکی ہی ہے جو اسلامیت اور اسلامی شناخت حاصل کرنے کی طرف کشاں کشاں رواں دواں ہیں، باقی تو سب بالخصوص سعودیہ وامارات سیکولرزم یعنی لادینیت کو قبول کرنے اور فروغ دینے میں لگے ہوئے ہیں، اسلامیت اور مغربیت کی یہ کشمکش اس وقت شباب پر ہے، فریق اول مغرب اور مغرب نواز لوگوں کے نشانے پر ہے، جبکہ فریق ثانی مغرب کی رضامندی کے فریب میں مبتلا ہے، اور بظاہر شیطان اپنے چیلوں سے راضی بھی ہے، اسلامیت اور شیطنت کی یہ

کشمکش بہت پرانی ہے، چراغ مصطفوی کے وجود سے ہی کفر وشرک کے سینوں میں بھٹیاں سلگنے لگی تھیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے ہے شرار بولہبی

لیکن بالآخر عزت ونصرت اور فتح وکامرانی ان ہی کے لیے مقدر ہے جو اسلام کی بالادستی کے خواہاں ہیں، اسی کے لیے جیتے ہیں، اسی کے لیے مرنے کا عزم رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ اس کی وضاحت فرمادی ہے۔

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون، ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (سورہ صف:۸-۹) (ترجمہ: یہ چاہتے ہیں کہ اپنے منھ سے اللہ کی روشنی کو بجھا دیں اور اللہ تو اپنی روشنی کو پوری کر کے ہی رہے گا، چاہے کافروں کو ناگوار گزرے، وہی خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے، تاکہ اس کو تمام مذاہب پر غالب کردے اگرچہ شرک کرنے والوں کو برا لگے)۔ اور فرمایا ہے وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنٰفقین لا یعلمون (سورہ منافقون:۸) (ترجمہ: حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کو حاصل ہے، لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں)۔

روہنگیوں کے ساتھ ظلم کی ایک وجہ تو وہ ہے کہ ان کو وہ بنگالی سمجھ کر وہاں رہنے نہیں دینا چاہتے، دوسرا الزام ان پر یہ لگاتے ہیں کہ انھوں نے مسلح جدوجہد کی ہے اور مسلح تحریک چھیڑی ہے، دنیا کی تاریخ میں جب کبھی ظلم کا گھناؤنا کھیل کھیلا گیا تو تاریخ کی شہادت ہے کہ کچھ جیالوں نے مقابلے کے لیے ضرور کمر کس لی اور یہ ٹھان لیا کہ مرنا ہے تو لڑکر مریں گے، روہنگیا مسلمانوں میں بھی بعض حوصلہ مند لوگ ظلم کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوگئے، ان کی تحریک کا نام (ARSA) ہے، یعنی Arakan Rohingya Salvation Army، ۱۹۴۸ سے اب تک روہنگیا پر وقتاً فوقتاً جو مظالم ڈھائے گئے ان پر کسی کو کوئی پریشانی نہ ہوئی، ۲۰۱۲ء کی پرتشدد کارروائیوں اور دل دہلانے والی وارداتوں نے بھی کسی کو نہ تڑپایا، مگر ہائے رے مہذب دنیا کی بے رحمی کہ اس مزاحمتی تنظیم کی دفاعی اور برائے نام کارروائیوں کو دہشت گردی کا نام دے دیا، ۲۵ اگست کو پیش آنے والی ان کی ایک کارروائی کو قتل عام اور بہیمانہ انداز سے نسل کشی کے لیے وجہ جواز بنا کر پیش کیا گیا، **آج کی دنیا میں ظالم کو ظلم کرنے کی کھلی آزادی ہے مگر مظلوم کے لیے تڑپنے کی گنجائش بھی نہیں، ظالم مغربی دنیا نے آج تک دہشت گردی کے اسباب جاننے کی کوشش نہیں کی، اور کیوں کرتی؟ کہ وہ تو خود دہشت گرد اور دہشت گردوں کی سرپرست ہے، اس کی دہشت گردی امن وسلامتی کے قیام کے نام پر جاری ہے، البتہ بنیادی حقوقِ شہریت محروم، فقر وفاقے کے مارے، اور انواع واقسام کے مظالم سہنے والے اگر کہیں اپنے دفاع میں اتر آئیں یا ظلم کے آگے سینہ سپر ہوجائیں تو ان کو دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے۔**

طُرفہ یہ ہے کہ تشدد زدہ ان علاقوں میں صحافیوں کو جانے کی اجازت نہیں، خیر سے اگر کسی کو اجازت دی جاتی ہے تو اسے ایسی پُرفریب تصویریں دکھائی جاتی ہیں اور جھوٹے لوگوں سے ملایا جاتا ہے کہ اگر واقعی حقیقت حال جاننے کا جذبہ نہ ہو تو آدمی روہنگیوں کو ظالم سمجھ کر واپس ہوجائے، آپ کو اس کی مثال سوشل میڈیا پر روہنگیا مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والوں کے

ذریعہ اپ لوڈ کی گئی تصویروں سے مل جائے گی، ہمارے ملک کی حکمراں جماعت سے متعلق افراد ہندستان میں پناہ گزیں روہنگیوں کو واپس بھیجنا چاہتے ہیں اور یہی منشا حکومت کی ہے، اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے احتجاج کیا گیا تو بھکتوں نے رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے یہ مہم بھی چھیڑ دی کہ وہ جعلی تصویریں اور ویڈیوز کے ذریعہ روہنگیوں کو دھشت گرد بتانے لگے اور انتہا پسند بودھ تنظیم Association for the protection of the race and religion کے بھیڑیوں اور چیتوں کو مظلوم بتانے لگے، ان کی بہیمانہ کارروائیوں کا فاعل مظلوم روہنگیوں کو قرار دے دیا، بہرحال ہمارے ملک کے پاس یہ عذر ہے کہ اس نے اقوام متحدہ کے رفیوجی ایکٹ ۱۹۵۱ پر دستخط نہیں کیا ہے، مگر صرف اس کے سبب وہ ان مظلوموں کو پناہ دینے سے عہدہ بر آ نہیں ہوسکتا، بھلا ہو پرشانت بھوشن کا جو ہمیشہ حق و انصاف کی لڑائی پوری قوت سے لڑتے رہے ہیں، دو روہنگیا مسلمانوں کی طرف سے انھوں نے سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کیا ہے جس پر سماعت بھی ہو رہی ہے، ایسے ہی ایک مقدمہ میں سپریم کورٹ کے ایک مثبت فیصلے کی نظیر بھی موجود ہے۔

ان مسلمانوں پر ظلم کے اسباب بیان کرتے ہوئے دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ روہنگیا مسلم اپنی ہر چیز پر ۷۸۶ لکھتے تھے، (جس کا لکھنا بہرحال جہالت ہے) بدھوں نے اس کو جوڑ کر اس کا مطلب ۲۱ نکالا اور پھر ''اسلاموفوبیا'' یعنی غلبۂ اسلام کے خوف نے انھیں آشن وراتھو کی زبانی یہ سمجھایا کہ ۲۰۲۱ میں اس ریاست پر مسلمانوں کا غلبہ ہوگا، جو محض افسانوی خیال تھا، اس کے مقابلے میں انھوں نے ۹۹۶ کا عدد استعمال کرنا شروع کیا جس کو بدھ مت میں خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قانونی بندشیں شروع ہوئیں، فوجی کارروائیاں ہوئیں اور اب تو فوج، پولیس، حکومتی مشنری اور سول سوسائٹی یعنی سب کی جانب سے مجموعی طور پر ان بے چاروں کو تہہ تیغ کرنے کی مہم جاری ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس پر تشدد کارروائی کے پیچھے ملکی اور بین الاقوامی دونوں طرح کی سیاست کارفرما ہے، رخائن اور بنگال کی کھاڑی کا یہ علاقہ قدرتی گیسوں Natural Gases سے مالا مال ہے، امریکہ نے انوسٹ کرنے کے لیے یہ شرط لگا رکھی ہے کہ اس علاقے کو مکمل طور پر خالی کرا کر دیا جائے تب وہ سرمایہ کاری (Investment) کرے گا، اس کے ساتھ ساتھ امریکہ اور اس کے حلیف چین کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے بھی برما کو اپنا اڈہ بنانا چاہتے ہیں اور اس کے لئے وہ چین کو وہاں سے مکمل طور پر لاتعلق کر دینا چاہتے ہیں، **امریکہ اور اس کی حلیف طاقتوں نے یہ پالیسی Strategy بھی بنا رکھی ہے کہ ظلم و تشدد کے ذریعہ ملکوں کو تاراج کیا جائے اور لوگوں کی ہجرت بالخصوص ان ممالک کی طرف کرائی جائے جن کو کچھ نہ کچھ معاشی استحکام حاصل ہو، تاکہ ان کی معاشی حالت کمزور ہوتی جائے اور ان کی کمر توڑ دی جائے، ظاہر ہے ترقی یافتہ ملک کی ایک بنیادی علامت اس کا معاشی استحکام اور اس کی مضبوط معیشت ہے، ترکی نے معاشی استحکام کی دوڑ میں بہت لمبی جست لگائی تھی، لیکن شام کے المیہ کے بعد اس کی معیشت پر کیا اثر پڑا ہے آپ اعداد و شمار سے اس کا اندازہ کر سکتے ہیں، آن ریکارڈ ترکی تیس لاکھ شامی اور دو لاکھ عراقی مہاجرین کی میزبانی کر رہا ہے اور اب بنگلہ دیش میں موجود برمی مہاجرین کا بھی کفیل بن گیا ہے، فسلطینیوں کے تئیں اس کی حمایت و ہمدردی پہلے سے جاری ہے، ملکی سطح کی سیاست اس واقعہ پر یوں ہو رہی ہے کہ آنگ سانگ سوچی کو مسلمانوں کی حمایت حاصل رہی**

تھی، وہاں کے دیگر عوام کی طرح مسلمانوں نے بھی اس سے امید لگائی تھی اور فوج کے مقابلے جمہوریت کی امید میں وہاں کے دیگر مسلمانوں نے اجتماعی طور پر اس کو ووٹ دیا تھا جبکہ روہنگیا تو پہلے سے ہی ووٹ دینے کے حق سے محروم کر دیے گئے تھے، اس المیہ کے ذریعہ ان مسلمانوں کی کمر توڑ دی گئی، ان کو کسی حمایت کے قابل ہی نہیں چھوڑا گیا، سوچی کو ایسے دوراہے پر کھڑا کر دیا گیا کہ وہ ایک بیان دینے کے قابل نہ رہی، وہ بولے یا خاموش رہے، بہرصورت یہ پیغام گیا کہ اس کے مقابلے فوج بہتر تھی، اس طرح تشدد کے ذریعہ کئی مقاصد پورے کیے جارہے ہیں، ہمارا مضحکہ خیز حال یہ ہے کہ جو خون چوس رہے ہیں جو ظلم کے رسیا بن چکے ہیں ہم ان ہی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہیں اور ان ہی سے رحم کی بھیک مانگ رہے ہیں۔

ہمارے سامنے ایک سوال ہے، جب یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ روہنگیا قضیہ قدیم ہے، یہ کوئی ابھی سال دو سال کی پیداوار نہیں تو پھر اس کو عالم اسلام نے حل کیوں نہیں کیا، جواب میں لوگ عالمی قانون کا حوالہ دیں گے، کہ ہر ریاست خودمختار ہوتی ہے، کسی کی داخلی خودمختاری میں کسی کو مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے، لیکن جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھتے آئے ہیں کہ یہ قانون کمزوروں کے لیے ہے، طاقتور تو جب جہاں چاہتے ہیں وہاں مداخلت کرتے ہیں، افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم جب بات کرتے ہیں تو ہم پر سیکولرزم کا بھوت سوار ہوتا ہے، جبکہ اغیار مذہبی جنون کے ہتھیار سے ہمہ وقت اور ہر آن سیکولرزم کا خون کرتے ہیں، ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ عالمی قانون ہو یا اقوام متحدہ دونوں ہی ویٹو پاور رکھنے والوں کی داشتہ ہیں، اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں، مسلم ممالک میں جاری کشت وخون نے یہ قضیہ صاف کر دیا ہے کہ یہود ونصاری اسلام کو مغلوب کرنے کے لئے چوطرفہ حملہ بول چکے ہیں، صورت حال وہ نظر آرہی ہے جس کی پیشن گوئی حدیث شریف میں یوں کی گئی ہے: "عن ثوبان مولى رسول الله ﷺ قال، قال رسول الله ﷺ: "يوشك أن تداعىٰ عليكم الأمم من كل افق كما تداعى الأكلة على قصعتها" قال: قلنا: يا رسول الله أمن قلة بنا يومئذ؟ قال: "أنتم يومئذ كثير، ولكن تكونون غثاءً كغثاء السيل تنتزع المهابة من قلوب عدوكم، ويجعل فى قلوبكم الوهن، قال: قلنا: وما الوهن؟ قال: "حب الدنيا، وكراهية الموت" (رواہ احمد ۳۷/ ۲۲۳۹۷)

''حضرت ثوبان سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ چہار جانب سے قومیں تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گے جس طرح کھانے والے پیالہ پر ٹوٹ پڑتے ہیں، روای کہتے ہیں ہم نے کہا، اے اللہ کے رسول ﷺ کیا اس وقت ہماری تعداد کم ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تعداد تو بہت ہوگی لیکن تمہاری حیثیت سمندر کی جھاگ کی مانند ہوگی، دشمن کے دل سے تمہارا رعب نکل جائے گا، اور تمہارے دلوں میں وھن پیدا ہو جائے گا، راوی کہتے ہیں، ہم نے کہا: وھن کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: دنیا کی چاہت اور موت سے نفرت''۔

جس عالمی قانون کا حوالہ دیا جاتا ہے اور جس اقوام متحدہ کو سہارا سمجھا جاتا ہے اس قانون کے وضع کرنے والے اور اس کے ٹھیکداروں کے مذہب میں ہمیشہ قانون کے دو پیمانے رہے ہیں، وہ امیر وطاقتور اور غریب وکمزور کے لئے ہمیشہ الگ الگ قانون نافذ کرتے رہے ہیں، بلکہ ان کی مقدس کتابوں میں تحریف کی یہ بھی ایک شکل رہی ہے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے

کہ اس وقت کی یہ ''مہذب'' دنیا صرف طاقتوروں کی سنتی ہے، بلکہ ماضی میں بھی یہ لوگ صرف اور صرف طاقت کی زبان سمجھتے رہے ہیں، جب عالم اسلام طاقتور ہوگا تو عالمی قانون بھی اس کا حمایتی ہوگا اور اقوام متحدہ بھی اس کی چوکیداری کرے گی، جو طاقتور ہوتا ہے دنیا اس کو سجدہ کرتی ہے، جو ایجادات کا امام ہوتا ہے دنیا اس کی غلامی کرتی ہے۔

بدقسمتی سے خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے والوں میں جو لوگ پیش پیش رہے اور جن کا مرکزی کردار رہا ان ہی کو عرصہ سے ملت اسلامیہ کا مرکزی قائد تصور کیا گیا، مگر ان کو کبھی نہ اعداد قوت کی فکر ہوئی اور نہ صنعتی انقلاب میں قائدانہ کردار کی سوجھی، وہ تو کھانے کی میز سے پاخانے کی کرسی تک استعمال ہونے والی تمام اشیاء کے امریکی، برطانوی اور جاپانی ہونے پر ہی باہم فخر ومباہات میں مبتلا ہوگئے، امت کے ذہین افراد صورت حال کو بھانپ گئے تھے، بالخصوص جنھیں فراستِ ایمانی ملی تھی انھوں نے بہت پہلے متنبہ کر دیا تھا، دیکھنا ہو تو دیکھیے کس طرح حضرت مولانا علی میاںؒ نے ماذا خسر العالم میں صنعت ومعیشت اور اعداد قوت کی طرف متوجہ کیا ہے، مگر اب تو وہ بھی زد پر ہیں اور ان کا لٹریچر بھی، یہ کام تنہا مولانا نے ہی نہیں انجام دیا بلکہ اس کی طرف توجہ دلانے والے مفکرین میں امام حسن البنا، سید قطب، ڈاکٹر سعید رمضان، محمد الغزالی اور مولانا مودودی وغیرھم شامل ہیں، ملت کے ان قائدین یعنی عرب حکمرانوں نے پورے طور پر یہود ونصاریٰ کا غلبہ قبول کر لیا، یہ ان ہی کو اپنے لیے نجات دہندہ سمجھنے لگے جن کے متعلق قرآن کے صریح ارشادات موجود ہیں کہ نہ ان سے دل لگایا جا سکتا ہے، اور نہ انھیں اپنے راز دیے جا سکتے ہیں، نہ انھیں اپنا یار ومددگار بنایا جا سکتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ولا تتخذوا منهم وليا ولا نصيرا (سورہ نساء:۸۹) (ترجمہ: لہذا تم ان میں سے کسی کو نہ تو دوست بناؤ اور نہ ہی مددگار)۔ يا يها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى اولياء (سورہ مائدہ:۵۱) (ترجمہ: اے ایمان والو ان یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ)۔ يايها الذين آمنو لا تتخذو الذين اتخذوا دينكم هزوا ولعبا من الذين اوتوا الكتاب من قبلكم والكفار اولياء (سورہ مائدہ:۵۷) (ترجمہ: اے ایمان والو جن لوگوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے، یعنی تم سے پہلے کے اہل کتاب اور ایمان نہ لانے والے، ان کو دوست نہ بناؤ)۔ امام جصاص نے نقل کیا ہے حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا من اعتز بالعبيد أذله الله، مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت عمر نے شام میں مقرر اپنے گورنر کو لکھا: كنتم أقلّ الناس وأذلّ الناس فكثّركم بالاسلام وكنتم أذل الناس فأعزّكم الله بالاسلام لهما تطلبوا العزة بغير الله يذلكم الله، لیکن اب تو صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف مسلمان ہی یہود ونصاریٰ کے ساتھ مل کر محاذ آرائی کر رہے ہیں، ان ہی کو عزت وقوت کا ذریعہ سمجھ رہے ہیں، دنیا کے سب بڑے قاتل وظالم کو امام حرم امنِ عالم کا ٹھیکیدار قرار دے رہے ہیں اس کے لیے برکت کی دعا کر رہے ہیں۔

ایک موقع پر رسول کریم ﷺ سے انصار صحابہ نے مشرکین کے خلاف یہود سے مدد لینے کی اجازت طلب کی تو رسالت مآب ﷺ نے فرمایا تھا یہ خبیث لوگ ہیں ان کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں، تفسیر مظہری میں یہ الفاظ ہیں "الخبيث لا حاجة لنا بهم" (ج۲ص۳۹۵، زکریا بکڈپو، دیوبند) جبکہ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ و ذكر الزهري أن الانصار استأذنوا حينئذ رسول الله ﷺ في الاستعانة بحلفائهم من يهود المدينة فقال "لا حاجة لنا بهم (البداية والنهاية ج۳ ص۱۱۲ المكتبة

التوفیقیة، مصر) اب تو حالت بایں جارسید کہ ایک ترکی جس نے رفتہ رفتہ بڑی حکمت سے صنعتی دھارے میں اپنی حیثیت تسلیم کرائی، اپنی معیشت کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا، حصولِ طاقت کو اپنا ہدف بنایا، اس لائق ہوا کہ اقوام متحدہ کی بے انصافیوں پر علمِ احتجاج بلند کر سکے، تو مغرب کے یہ گماشتے مغرب وامریکہ کے اشارے پر اس کی جان کے دشمن بن گئے، اس کی جڑیں کھودنے لگے، اماراتی سفیر کے ای میل سے جس گھناؤنی سازش کا پردہ فاش ہوا اس کے سبب ان جبہ پوشوں سے گھن آنے لگی، عرصہ سے عالم اسلام اسی انتشار اور حکمرانوں کے نشۂ اقتدار کی بدمستی کے سبب آپسی رسہ کشی کا شکار ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ خون مسلم کی ارزانی ہے۔

کاش عالم اسلام طاقتور ہوتا تو برمی حکومت کی کیا مجال تھی کہ وہ ظلم وبربریت کے اس ننگے ناچ کو بند نہ کرتی۔ پاکستان کے ایک ماہنامہ ''نقیب ختم نبوت'' نے ستمبر ۱۷ء کے شمارے میں سید شہاب الدین شاہ کا ایک مضمون ''روہنگیا مسلمان مظلومیت کے تناظر میں'' شائع کیا ہے، مضمون نگار نے جنرل ایوب کا ایک بیان نقل کیا ہے، جس سے ہمارے نظریہ کی تائید ہوتی ہے، اس بیان کی صحت وسند پر بحث سے قطع نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت اور آج کے حالات میں بہت فرق ہے، مگر کیا یہ سچ نہیں کہ ''مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی، اور کیا اسلام نے رعب ودبدبہ کی تیاری کا حکم نہیں دیا، مضمون نگار لکھتا ہے:

> ''پاکستانی صدر جنرل محمد ایوب خان کے دور میں جب برمی حکومت نے اراکانی مسلمانوں کو ستانا اور تنگ کرنا شروع کر دیا تو پاکستانی صدر نے یہ بیان جاری کیا کہ ''کیا برمی حکومت یہ پسند کرے گی کہ پاکستانی فوج صبح ڈھاکہ سے روانہ ہو اور شام تک رنگون (برما کا دارالحکومت) پہنچ جائے''، اس بیان کی وجہ سے جب تک ایوب خاں صدارت پر رہے تب تک اراکانی مسلمان برما کے مظالم سے محفوظ رہے اسی لیے آج بھی اراکانی مسلمان جنرل محمد ایوب خان کے لیے دعائیں کرتے ہیں، (ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان ستمبر ۲۰۱۷، جلد ۲۸، شمارہ ۹)۔

مگر آج تو ہم بس اسی تمنا پر اکتفا کرتے ہیں کہ کاش مسلم ممالک ترکی کی جرأت گفتار پر اس کے حامی ہی ہو جاتے تو بھی صورت حال کچھ اور ہوتی، لیکن جہاں ظلم کے ڈرامے میں مغربی آقاؤں کا کردار ہو وہاں عرب غلام کیوں کر لبوں کو جنبش دیں گے، جنھوں نے قطر پر دہشت گردی کا الزام دھر کے اس کا بائیکاٹ کیا ان کی یہ حالت ہے کہ برما میں دہشت گردی انتہا کو پہنچ گئی اور احتجاج تک نہ درج کرا سکے۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ اس پر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ترکی کے اقدامات کو سعودی حمایتی اور وہ پروپیگنڈہ ماسٹر شاہ صاحب کی طرف پوری بے شرمی سے منسوب کرنے لگے، یہاں تک جھوٹ بولا۔ ظاہر ہے جھوٹ کے پر تو ہوتے نہیں، جتنی چاہیں بے پر کی اڑائیں۔ کہ سعودیہ نے دس لاکھ برمیوں کو شہریت دے دی، واقعہ ہے کہ سعودیہ میں برمی مسلمان موجود ہیں مگر وہ چالیس پچاس سال پہلے سے ہیں، سعودیہ میں اب کسی کو شہریت نہیں ملتی، شاہ فیصل کے ساتھ حصولِ شہریت بھی تقریباً ختم ہوگئی، اب خال خال کسی کو سعودی حکومت شہریت دیتی ہے، یہ سختی شاہ فہد کے دور سے ہی شروع ہوگئی تھی، ایسا ہی جھوٹ محاصرۂ اقصی کے خاتمہ پر جب فلسطینی جیالے فتح کا جشن منا رہے تھے تو بھی بولا گیا تھا کہ شاہ صاحب کی مداخلت اور بات چیت سے مسئلہ حل ہوا ہے، اب تو شاہ صاحب کو ان قضایا سے کوئی مطلب ہی نہیں کہ وہ تو خادم الحرمین ہیں اور دین بھی حرمین تک محدود ہے، یہ سارے مسائل نہ حرمین سے متعلق ہیں اور نہ ان لوگوں کے نقطۂ نظر سے دین سے تعلق رکھتے ہیں، یہ سب ''رئیس الدولۃ''

کے دائرہ اختیار کے امور ہیں، ''رئیس الدولہ کا لقب دیا گیا ہے ولی عہد محمد بن سلمان کو جو بہت برق رفتاری سے سعودیہ کو سیکولر اسٹیٹ میں تبدیل کر رہے ہیں اور یہود ونصاریٰ کے تمام پروجیکٹس کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں، جو سلطان کے مدح سرا ہیں سلطانی قہر و جبروت سے خائف ہیں وہ سعودیہ کی لادینی حیثیت سے راضی ہیں، اور جن سے طاغوتی طاقتوں کو امید ہے کہ وہ سپر نہ ڈالیں گے ان کو پابند سلاسل کیا جارہا ہے۔

ہم نے ایک روز جبکہ پورا سوشل میڈیا برمی مسلمانوں کے مظلومین کے لیے سراپا احتجاج بنا ہوا تھا یہ لکھا تھا:

''برما میں ہونے والی نسل کشی سے زیادہ خطرناک سعودیہ وامارات میں ہونے والی اسلام کشی ہے، علمائے حق کی گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہے، شیخ سلمان العودہ اور عوض القرنی سمیت سینکڑوں علماء گرفتار کیے جاچکے ہیں، اب تک قید وبند میں جانے والے علماء کی تعداد ۸۰ ہزار تک پہنچ چکی ہے، یہ فکر اسلامی اور زندہ ضمیری کو قتل کرنے کی گھناؤنی سازش ہے''

ظاہر ہے میں نے جو کچھ لکھا تھا بہت سوچ سمجھ کر لکھا تھا، سعودیہ اب جو کچھ کھل کے کر رہا ہے پہلے ذرا خفیہ طریقے سے کرتا آیا ہے، مصر وشام میں اسی کے کردار سے اہل اسلام نہ صرف ناکام ہوئے بلکہ ان مظالم کا شکار ہوئے جنھیں دیکھ کر چنگیز وہلاکو کانپ جاتے۔ اس سے پہلے عراق میں جو کھیل کھیلا گیا وہ کس سے ڈھکا چھپا ہے، ملت کی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی کس طرح امریکیوں نے اور شیعہ ملیشیاؤں نے عصمت دری کی ہے کیسے بتائیں ہم، لاکھوں اہل سنت عراق میں مارے گئے اور صدام کے مرتے ہی شیعہ طاقتیں بے لگام ہوگئیں، جاننے والے سقوط بغداد میں بھی سعودیہ کے گھناؤنے کردار سے واقف ہیں۔ شامی مسلمانوں پر جو قہر ٹوٹا ہے وہ یقیناً قیامت سے کم نہیں، اہل برما مظلوم ہیں اور ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں مگر حجاز سے دین اسلام کو دیس نکالا دیا جارہا ہے، علماء وعالمات اور فکر اسلامی کے حاملین کو دہشت گرد قرار دیا جارہا ہے، جب ایمان ہی داؤ پر لگ جائے تو جان کی کیا قیمت؟ **برما میں یقیناً اسلام دشمنی قتل عام کا سبب ہے، لیکن قاتل وہ ہے جس سے کوئی شکوہ ہی نہیں، وہاں تو اسلام کے قاتل، اقدار پر ڈاکہ ڈالنے والے، معصوموں، روزہ داروں نمازیوں اور ڈاڑھی رکھنے والوں کے قاتل غلاف کعبہ میں لپٹے ہوئے ہیں، ان ہی کی عیاشیوں کی ضمانت کے وعدے پر جزیرۃ العرب تاراج ہورہا ہے، اور تہذیب اسلامی کا صفایا کرکے تمدنِ یہود ونصاریٰ کی جلوہ نمائی ہورہی ہے۔**

مسلم ممالک کی جابرانہ سیاست اور مستبدانہ پالیسیوں کے سامنے وہاں کے علماء اور دانشوران مجبور ہوچکے ہیں، اب تو صورت حال یہ ہے کہ خاموشی پر بھی سزا دی جاری ہے، مشہور ترین داعی وعالم دین شیخ سلمان العودہ سمیت ۲۰ علماء کو محض اس لیے گرفتار کیا گیا کہ انھوں نے قطر کے تئیں حکومت کے موقف کی تائید نہیں کی بلکہ انھوں نے اتحاد بین المسلمین کی دعا کی، خلیجی اخبارات نے ان مخلص علماء کو دہشت گرد لکھا اور وہاں کا میڈیا عرصہ سے دین پسندوں اور دینداروں کو ''ارہابی'' لکھ رہا ہے، وہاں کی صورت حال اب یہ ہے کہ لب کھلیں تو آقا کی مدح سرائی میں ورنہ خاموشی بھی جرم ہے، گزشتہ سال پروفیسر محسن عثمانی صاحب نے بڑے کرب کے ساتھ ایک مضمون لکھا تھا ''وہ بات خطبۂ عرفات میں جس کا ذکر نہ تھا''، معلوم نہیں اس مرتبہ انھوں نے خطبہ سنا کہ

نہیں، **خطبۂ عرفات میں امام صاحب نے ارشاد فرمایا تقربوا اللہ بالدعاء لحکام آل سعود ،حکام سعودیہ کے لیے دعا کرکے اللہ کا قرب حاصل کرو، میدان عرفات میں جمع مسلمانوں کے اتنے بڑے اجتماع کو یہ پیغام دیا گیا، خدا بھلا کرے ان مخلصین کا جواب بھی سود وزیاں سے بے خبر کلمۂ حق بلند کررہے۔**

برما کی صورت حال وہ تھی جس پر مسلم حکمرانوں سے قرآن کا یہ خطاب سو فیصد منطبق ہوتا ہے۔ وما لکم أن لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنك ولیا واجعل لنا من لدنك نصیرا (سورہ نساء:۷۵) مگر یہ بے چارے یہ کام نہیں کرسکتے کیوں کہ وہ مجبور ولاچار، بے بس اور بے سروساماں ہیں، ان کو جو ہتھیار دیے جاتے ہیں وہ اس شرط پر کہ ان سے اپنے ہی بھائیوں کا خون بہایا جائے، افسوس تو اس پر ہے کہ عرب کے پٹھو نہ خود کچھ کرنے پر تیار ہیں اور نہ کرنے والوں کی پشت پناہی پر آمادہ، نفاق کی ساری حدیں انھوں نے پار کرلی ہیں، وہ اس وقت تک قرآن کی مطلوب اس پوزیشن میں نہیں ہوں گے، جب تک آزاد قلم اور آزاد زبانیں موقع کو غنیمت جان کر ان کا احتساب نہیں کریں گی اور ان کو صحیح راہ نہیں دکھائیں گی، تب تک ہر سال ایک نیا خونی کھیل کھیلا جاتا رہے گا، اس کا اسٹیج خواہ برما ہو یا شام یا عراق یا کوئی اور مسلم آبادی والا ملک، امداد کی اپیلوں احتجاجی مظاہروں اور دعاؤں سے کائنات کا نظام نہیں چلتا، کائنات کا نظام کچھ اور ہے، جس کی بابت ارشاد ہے ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا اور ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا ،جس کی عملی مثال نبی اکرم ﷺ کی سیرت میں موجود ہے، اگر دعاؤں پر دنیا کا نظام اللہ تعالیٰ چلاتے تو پھر دعا نبی کریم ﷺ مدینہ میں بیٹھ کر مانگتے، میدان جنگ میں جاکر نہ مانگتے، آج آنسوؤں کا سیلاب ہے، خون کی ندیاں ہیں، حرمین شریفین کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں دعائیں کی جاتی ہیں، لیکن بقول مولانا آزاد:

''دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں مگر ان ہی کو جو عزم وہمت رکھتے ہیں، وسائل بہم پہنچاتے ہیں، اور ان کا بہترین استعمال کرتے ہیں، بے ہمتوں کے لیے دعا ترکِ عمل اور تعطلِ قویٰ کا حیلہ ہوتی ہے''۔

اقبال نے کہا تھا ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

اس وقت برمی مسلمانوں اور ایسے تمام مظلوموں کے لیے جو بَن پڑے وہ کرنا چاہیے، اچھی بات ہے کہ لوگ بیدار ہوئے، بڑے پیمانے پر مظاہرے ہورہے ہیں، امدادی ٹیمیں بھی اپنے کام پر لگ گئی ہیں، **سرِ دست ہمیں بھی اپنے ملک میں اپنے نزدیک موجود روہنگیا پناہ گزینوں کے رہنے اور کھانے کے انتظامات میں حصہ لینا چاہیے۔** پاکستان کے بیرسٹر اقبال جعفری آنگ سانگ سوچی اور آشن وراتھو پر عالمی عدالت انصاف میں فوجداری کا مقدمہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں، لیکن یہ سب جزء وقتی حل ہیں، اگر ایسے ہی لوگ ہجرتیں کرتے رہے، اور ایسے ہی کبھی کوئی کبھی کوئی علاقہ خالی کرایا جاتا رہا تو اس سے مسائل بڑھیں گے، مسائل کا خاتمہ نہ ہوگا، **اس کے دائمی حل کے لیے ضروری ہے کہ عالمی پیمانے پر علماء ودانشوران اپنے مفادات سے بالا ہوکر عالم**

اسلام کے ضمیر کو بیدار کرنے، اسے جھنجھوڑنے کا فریضہ انجام دیں، اگر اب بھی یہ کام نہ کیا گیا تو جو جو ہم لکھتے اور دیکھتے آئے ہیں، رفتہ رفتہ ان ہی حالات کا مشاہدہ دنیا کر رہی ہے، تیسری جنگ عظیم کے متعلق بہت پہلے سے دنیا بھر کے اسکالرز پیشین گوئیاں کر رہے ہیں، بلکہ موجودہ وقت میں اگر متعدد تحریروں پر اعتماد کیا جائے تو پنٹاگن میں جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والے انسانی بحران Human crisis پر قابو پانے سے متعلق بحثیں ہو رہی ہیں، مگر افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ پہلی دونوں جنگ عظیم یورپ کی سرزمین پر ان ہی کے مابین لڑی گئیں، اگر چہ اس میں مسلمانوں کا شدید ترین نقصان ہوا اور مسلمانوں کی طاقت بکھیر کر رکھ دی گئی، چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں تقسیم کر کے عالم اسلام کو بے حیثیت کر دیا گیا اور مزید تقسیم کے لیے امریکہ بہادر شطرنج کی چالیں چل رہا ہے، آج کل ''کردریاست'' کی تشکیل سے متعلق خبریں گرم ہیں، لیکن یہ تیسری جنگ مشرق وسطیٰ Middle east میں مسلمانوں کے درمیان لڑی جائے گی، سعودی عرب کا رویہ، امریکہ کی بے لگام تاناشاہی، ترکی، ایران، روس اور قطر کا بظاہر بنتا ہوا محاذ کسی خطرناک نتیجہ پر ہی منتج ہوگا، ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر سعودی واماراتی بے راہ روی ختم نہ ہوئی اور ان کی سیاست اسرائیل سے ہی کنٹرول ہوتی رہی، اور موجودہ خلیجی بحران پر قابو نہ پایا گیا، اور قابو نہ پانے کی صورت میں ترکی، قطر اور ایران وروس کا محاذ بن گیا تو پھر جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا، اللہ عالم اسلام کی ہر شر سے حفاظت فرمائے اور حالات کا رخ بدلنے والے افراد کے ہاتھ مضبوط کر دے وھوالموفق والمستعان،

ڈیرا سچا سودا کی کہانی اور ایک الگ زاویۂ نظر: سوچو آخر کب سوچو گے

ڈیرا سچا سودا کے کالے کرتوتوں کا پردہ فاش ہوا، تو تاریخ کے کئی واقعات ومناظر نظروں کے سامنے آ گئے، بابا گرمیت سنگھ نے اس ڈیرے میں کیا کیا گل نہیں کھلائے، جس کو انھوں نے ''سچا سودا'' کا نام دیا وہ یکسر ''جھوٹا سودا'' نکلا، اپنا نام بھی انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر رکھا تھا ''بابا رام رحیم''، لیکن اپنے کرتوتوں کے باعث وہ بابا ''رجیم'' تھے اور اب تو وہ عدالت وعوام سب کی نظر میں ''رجیم'' بن گئے، ان کے متعلق تفصیلات بڑے پیمانے پر میڈیا میں نشر ہوئیں، خواہی نہ خواہی میڈیا کو یہ کام کرنا پڑا، کیوں کہ میڈیا کے نمائندے بھی بھکتوں کی زد پر چڑھ گئے، بھگتوں نے بابا پر الزام ثابت ہونے کے بعد پنجاب وہریانہ کی اینٹ سے اینٹ بجا ڈالی، اس دوران جو میڈیا اہلکار ہتھے چڑھ گئے ان کا حساب بھی بے باق کر دیا، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے والوں پر جب افتاد پڑی تو آنکھوں سے پٹی اتارنی ہی پڑی اور حقائق کو عام کرنا ہی پڑا، پھر بھی میڈیا والے نکلے بڑے سخت جان، ان بلوائیوں کو انھوں نے نہ دیش دروہی لکھا اور نہ دہشت گرد قرار دیا، وہ تو اچھا ہوا کہ ان بلوائیوں کا رشتہ نہ کسی مسجد سے تھا اور نہ مدرسے سے، ورنہ خدا معلوم میڈیا نے کیا کیا گل کھلائے ہوتے، بہر حال عوام جس طرح بابا کے دیوانے ہو کر اتاؤلے ہو رہے تھے اس پر سرکار اور سرکاری مشنری بھی قابو پانے میں کسی حد تک ناکام رہی، اور ناکام کیوں نہ ہوتی جبکہ سرکار بابا ہی کے آشرواد سے شادکام ہو چکی تھی، سرکار کی بے اعتنائی، لاپرواہی اور کھلم کھلا چشم پوشی پر ملک کی تاریخ میں پہلی بار کسی ہائی کورٹ کے ذریعہ ملک کے وزیر اعظم سے کہا گیا کہ ''مودی جی کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ بی جے پی کے نہیں ملک کے وزیر اعظم ہیں''۔ بابا کا قافلہ جس طرح نکلا تھا اس سے صاف ظاہر

تھا کہ حکومت ان کو راہ فرار دینا چاہتی تھی مگر اس میں ناکام رہی، اس پر خوب بحثیں بھی ہوئیں اور بھاجپائی کٹہرے میں بھی کھڑے ہوئے، بھلا ہو ان لڑکیوں کا جن پر نہ ان کے ماں باپ نے اعتماد کیا اور نہ سماج نے مگر وہ ظلم اور توہم پرستی اور اندھی عقیدت کے خلاف لڑتی رہیں تا آنکہ ظالم کو سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا، اس جج کی انصاف پسند طبیعت اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانے کی جرأت کو بھی سلام جس نے یہ ثابت کر دیا کہ **اگر انسانی ضمیر اپنا کام کرے تو نہ اس کو خریدا جا سکتا ہے اور نہ اس پر کوئی رعب و ہیبت اپنا دبدبہ قائم کر پاتی ہے**، ملک کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا جب کسی مجرم کو سزا سنانے کے لئے سی بی آئی کی خصوصی عدالت کے جج کو ہیلی کاپٹر سے جیل لایا گیا اور جیل ہی میں وقتی عدالت قائم کی گئی، سوچیے ذرا مجرم کی جڑیں سماج میں کتنی دور تک پھیلی ہوئی تھیں، کہ اس کے لیے اس قدر انتظامات کرنے پڑے، اس کو بچانے کے لیے لوگوں نے کیا کچھ نہیں کیا، جو لوگ مجرمین کی وکالت کرتے ہیں اور ان کو بچانے کے لیے اپنی پوری طاقت جھونک دیتے ہیں ان تک قرآن کی بیان کردہ یہ حقیقت پہنچانا چاہیے، کہ اس دنیا میں تو چالبازی اور طاقت کے ذریعہ مجرم کی پشت پناہی کی جاسکتی ہے لیکن آخرت میں اس کائنات کے مالک کی عدالت میں کون پشت پناہی کی جرأت کر سکے گا۔

هأنتم هؤلاء جدلتم عنهم في الحيوة الدنيا فمن يجدل الله عنهم يوم القيمة أم من يكون عليهم وكيلا (نساء:۱۰۹)(ترجمہ: دنیاوی زندگی میں تو ان کی طرف سے تم نے مدافعت کر لی تو قیامت کے دن ان کی طرف سے اللہ کے سامنے کون مدافعت کرے گا یا کون ان کا کارساز ہوگا)

اس واقعہ کے کئی رخ اور اس کی اچھی خاصی تفصیلات ہیں، جن کا بڑا حصہ قارئین کی نظر سے گزر چکا ہوگا، ان کو یہاں نقل کرنا محض طوالت کا باعث ہوگا، یہاں تو صرف اس واقعہ کو اس زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی جائے گی جس سے تاریخ کے بہت سے واقعہ کو صحیح قرار دینے پر ہر سچا ہندستانی مجبور ہوگا، لیکن اس سے پہلے اس پر بھی کچھ توجہ ضروری ہے کہ آخر یہ واقعہ جس نے بی جے پی کو کہیں نہ کہیں بیک فٹ پر پہنچایا ہے آخر بی جے پی کے دور اقتدار میں کیوں کر پیش آیا، جبکہ بی جے پی اقتدار میں بابا کے آشرواد سے آئی تھی، بابا نے کھل کر اس کو سپورٹ کیا تھا، اس کی حمایت کا اعلان کیا تھا، اور بی جے پی نے بھی سارے کیس ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا، یہ بھی سچائی ہے کہ یہ کیس بی جے پی کے پہلے دور اقتدار میں اس وقت کے وزیر اعظم واجپئی کو لکھے گئے خط سے شروع ہوا تھا، اگر بی جے پی نے بابا سے اپنا دامن چھڑانا چاہا تو پھر آخر اس قدر لاچار و بے بس کیوں نظر آئی اور بلوائیوں کو کروڑوں کی املاک کو کیوں نقصان پہنچانے کی اجازت دی، کئی درجن جانیں کیوں گئیں اور سینکڑوں لوگ زخمی کیوں ہوئے، **شنید یہ بھی ہے کہ اس خصوصی جج کو خریدنے کی بھی کوشش ہوئی اور اس کو دھمکیاں بھی دی گئیں لیکن وہ جھکا بھی نہیں اور بکا بھی نہیں، کاش سعودیہ و مصر کے مسلم کہلانے والے ججز اسی کو نمونہ بنا لیتے، جس نے آستھا، اندھ وشواش، اندھ بھکتی اور اقتدار کے دباؤ سے بالا ہو کر سب کو انصاف کے قلم کی ٹھوکر پر رکھا اور ظالم کو ظالم ثابت کرنے کے لیے اپنے فیصلے کی مہر لگا دی**، راقم سطور کا احساس یہ ہے کہ بی جے پی کو اس واقعہ سے نقصان کم فائدہ زیادہ ہوا ہے، بھکتوں کی نظر میں اچھا بننے کے لئے جو کچھ کرنا تھا اس نے کیا پھر بھی ان کی نظر میں بری بن گئی، لیکن اس واقعہ سے ملک کے عوام کو وہ مثبت پیغام دینے میں کامیاب ہوگئی، رہا بھکتوں کا مسئلہ تو وہ ٹھہرے بھکت، روٹھ کر بھی دامن نہ

چھوڑیں گے، ظاہر ہے کہ واجپئی اور مودی کے درمیان دس سال کانگریس کی حکومت رہی اور بابا کی بھکتی کے گیت دونوں ہی پارٹیوں کے نیتا گاتے رہے، لیکن کیس کی ابتدا بھی بھاجپا کے اقتدار میں ہوئی اور انتہا بھی اسی کے اقتدار میں، سوشل میڈیا پر ہونے والی بحثوں میں جب مرکزی وصوبائی حکومتوں کی کھلی ہوئی حمایت وسرد مہری پر عار دلائی گئی تو بار بار یہی جواب دیا گیا کہ آپ یہ بھی دیکھیے کہ ڈرامہ کو انجام تک کب اور کس کے دور اقتدار میں پہنچایا گیا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ باباجی کی آخری سواری وزیر اعظم صاحب کا خاص ہیلی کاپٹر بنا، واقعہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے حکومت کے کردار کو مشکوک تو قرار دیا جائے گا، لیکن اس ایک تیر سے اس حکومت نے کتنے شکار کیے؟ یا جس طرح نظر آیا کہ وہ بیک فٹ پر گئی ہے، واقعتاً یہی ہوا! اس کا پردہ آنے والے وقت میں ہی فاش ہوگا، فی الحال کوئی حتمی رائے قائم کرنا اپنے بس کی بات نہیں۔

اب آیئے اس قصے کے دسرے پہلو کی طرف جو درحقیقت موضوع ہے، جو تفصیلات نشر ہوئیں، ان کے بموجب ڈیرا عیاشی کا ایک اڈہ تھا، دوران تلاشی ڈیرے میں موجود گوفہ یعنی سرنگ سے ہوکر بنائے جانے والے غار نما عیش محل میں ایٹم بم کے علاوہ کیا کچھ نہیں نکلا، بابا کے حرم سرا کی کہانی یوں طشت از بام ہوئی کہ سنیاسیوں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن گئی، اس سے پہلے اسی جرم میں آسارام سلاخوں کے پیچھے جا چکے ہیں، ڈیرے پر الزام ہے کہ وہاں جو لڑکیاں بھی سادھو بننے کے لیے رہتی تھیں ان کا جنسی استحصال ہوتا تھا، زبان کھولنے کی کسی میں جرأت نہیں ہوتی تھی، بابا پر قتل کے الزام ہیں بھی اور ثابت بھی ہوگئے ہیں، ڈیرے کے باغی بھکتوں کا کہنا ہے کہ اگر کھدائی کرائی جائے تو لاشوں کی باقیات کا ملنا یقینی ہے، سوچیے ذرا وہ لڑکی کتنی لاچار و بے بس ہوگی جس کی عصمت لٹی، مگر اس کے والدین اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں، بلکہ عصمتوں کے سوداگر اور ہوس کے پجاری کی پوجا وارچنا کرنا اپنا ایمان سمجھ رہے تھے، برا ہو اس توہم پرستی کا جس نے نہ جانے کتنی خواتین کو سادھو سنتوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا، سوچیے ذرا ڈیرے میں سنیاسی بابا گرمیت نے کتنی عصمتیں پامال کی ہوں گی، اس کی اخلاقی گراوٹ کی انتہا تو یہ ہے کہ جب وہ ایک عورت کے ساتھ بڑھتی قربت کے نتیجہ میں الزامات کے گھیرے میں آیا تو اس نے اس کو منہ بولی بیٹی قرار دے دیا، لیکن اس کے ساتھ جو تصاویر منظر عام پر آئیں وہ آج کل کی گندی تہذیب کے ''فرینڈ شپ'' والے رشتوں کی عکاس تھیں، ڈیرے میں اس قدر خواتین کا کیا کام تھا، وہاں سے جس قدر اسلحے برآمد ہوئے ان کی کیا ضرورت تھی، حکومت باباؤں کی دولت وثروت اور آمدنی کو ہر طرح کے ٹیکس سے بری رکھتی ہے، اگرچہ خالص سماجی خدمت کرنے والی چھوٹی چھوٹی تنظیموں کو بھی انکم ٹیکس کا نوٹس آجاتا ہے، حکومت کے اس رویّے اور عوام کے اندھ وشواس کے نتیجے میں یہ ڈیرے اور آشرم کیا کیا گل کھلاتے ہیں یہ بات اب کھل کر سامنے آگئی، ڈیرا سچا سودا، زنا اور عیاشی کا اڈہ تھا، اسلحوں کا ذخیرہ اس کی دیش بھکتی پر سوالیہ نشان لگاتا ہے، فیصل ہوئے مقدمات سے اس کی مجرمانہ کارروائیاں واضح ہوجاتی ہیں۔

یہاں اس پورے واقعہ کی تفصیلات میں جائے بغیر صرف جو کچھ تفصیلات آپ تک پہنچ چکی ہیں ان کی روشنی میں اہل قلم کی توجہ اس طرف مبذول کرانا ہے کہ وہ تاریخ کی سچائیوں کو بطور مثال ان کھلے ذہن والوں اور انصاف پسند لوگوں کے سامنے پیش کریں، جن کے ذہنوں میں زہر گھولنے کا کام وہ طبقہ کرتا ہے جو اب بھی بابا کی بھکتی پر راضی ہے، جبکہ دسرا بڑا طبقہ وہ ہے جس کے نمائندوں نے ٹی وی چینلز پر حکومت کی حمایت، اندھ بھکتی اور اس طرح کے ڈھونگی باباؤں کی بخیہ ادھیڑ کر رکھ دی، یہ موقع ہے حکمت

کے ساتھ دعوتی لٹریچر کو عام کرنے کا، مسلم حکمرانوں بالخصوص اورنگ زیب اور محمود غزنوی پر مندر شکنی سے متعلق ہونے والے اعتراضات کو ذہنوں سے کھرچ کر صاف کر دینے کا۔

مسلم بادشاہوں بالخصوص اورنگ زیب کے ذریعہ مندروں پر کارروائی اور سومناتھ مندر کو لے کر عام طور پر ہندوؤں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے، کہ ان لوگوں نے تمام مندروں کو لوٹا، برباد کیا، انھیں توڑ کر اس کی جگہ پر مسجدیں بنائیں، جبکہ واقعہ اس کے خلاف ہے، حقائق ان الزامات کو منہ چڑاتے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں، مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری اپنی مثال آپ تھی، مسلم حکمران اگر چاہتے تو ہندوستان میں نہ کوئی مندر رہتا نہ کوئی ہندو، لیکن انھوں نے اپنی مذہبی رواداری، اسلامی تعلیمات اور وسیع القلبی کے سبب ایسا کچھ نہیں کیا، انھوں نے تمام اقوام کے عبادت خانوں کا احترام کیا، کیوں کہ یہی اسلام کی تعلیم تھی، سب سے زیادہ اورنگ زیب عالمگیر نے مندروں اور مٹھوں کے لیے جائدادیں وقف کیں جن میں سے بعض کی دستاویز بنارس ہندو یونیورسٹی میں بھی موجود ہے، اس کے علاوہ متعدد لوگوں کے پاس اس طرح کی دستاویزیں اور فرامین عالمگیری آج بھی موجود ہیں، اسی طرح کا ایک واقعہ بی این پانڈے کی الہ آباد میں میونسپلٹی کی چیرمین شپ (۵۲-۱۹۴۸) کے درمیان پیش آیا تھا، جب سومیشور ناتھ کے مہا دیو مندر کو دان کی گئی ایک زمین کا جھگڑا سامنے آیا تو اس میں دان کے کاغذات جو نکلے وہ اورنگ زیب کے دیے ہوئے تھے (ص ۳۷ اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد، مترجم فیضان رشید) یہ محض کوئی ایک ہی واقعہ نہیں بلکہ اورنگ زیب کے ذریعے مندروں، مٹھوں اور گرودواروں کو اراضی وقف کرنے کے بے شمار فرامین ۱۶۵۹ء سے ۱۶۸۵ء کے درمیان کے ملے ہیں۔

مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری کے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن اپنی کتاب ''اسلام میں مذہبی رواداری'' میں پروفیسر رام پرشاد گھوسلا کی یہ شہادت نقل کرتے ہیں ''پروفیسر رام پرشاد گھوسلا اپنی کتاب مغل کنگ شپ اینڈ نوبلیٹی میں لکھتے ہیں: ''مغلوں کے زمانہ میں عدل وانصاف میں جو اہتمام ہوتا اور جو ان کی مذہبی رواداری کی پالیسی تھی اس سے عوام ہمیشہ مطمئن رہے، اسلامی ریاست میں سیاست اور مذہب کا گہرا لگاؤ رہا ہے، لیکن مغلوں کی مذہبی رواداری کی وجہ سے اس لگاؤ کی وجہ سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا، کسی زمانہ میں بھی یہ کوشش نہیں کی گئی کہ حکمراں قوم کا مذہب محکوموں کا بھی مذہب بنا دیا جائے، حتی کہ اورنگ زیب نے بھی حصول ملازمت کے لیے اسلام کی شرط نہیں رکھی تھی، مغلوں کے عہد میں fermilao act یا corporation act جیسے قوانین منظور نہیں کیے گئے، ایلزبتھ کے زمانہ میں ایک ایسا قانون تھا، جس کے ذریعہ جبری طور پر عبادت کرائی جاتی تھی، مغلوں کے زمانہ میں اس قسم کا کوئی جبر نہیں کیا گیا، Bartholomews day کے جیسے قتل عام سے مغلوں کی تاریخ کبھی داغدار نہیں ہوئی، مذہبی جنگ کی خوں ریزی سے یورپ کی تاریخ بھری ہوئی ہے، لیکن مغلوں کے عہد میں ایسی مذہبی جنگ کی مثال نہیں ملتی، بادشاہ مذہب اسلام کا محافظ اور نگہبان ضرور سمجھا جاتا، لیکن اس نے کبھی غیر مسلم رعایا کے عقائد پر دباؤ نہیں ڈالا۔ (اسلام میں مذہبی رواداری از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۲۸۷، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ)

یہ ہے وہ اصل چہرہ جس کو مسخ کرنے کی متعصب مؤرخین نے کوشش کی ہے، جس کے سبب عام طور پر ہم دفاعی پوزیشن میں آجاتے ہیں، کیوں کہ حقائق نہ ہم کو معلوم ہیں اور نہ ملک کے نظام تعلیم سے فارغ ہمارے بچوں کو، جس کے سبب ہم کٹہرے میں کھڑے کردیے جاتے ہیں۔

مندروں کو لوٹنے کا الزام سراسر فضول ہے، کسی بھی مسلم حکمراں نے کوئی مندر لوٹا اور نہ اسے توڑ کر اس کی جگہ مسجد بنائی، البتہ مندروں کو لوٹنے کی عادت خود ہندو راجاؤں میں پائی جاتی تھی حد تو یہ ہے کہ بعض راجاؤں نے ''مندر لوٹ'' محکمہ ہی قائم کردیا تھا، بارہویں صدی میں کشمیر کے ہرش نامی حکمراں نے یہ محکمہ قائم کیا، اس کی اور بھی مثالیں تاریخی شواہد کے ساتھ موجود ہیں۔ (اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ص ۱۸)

اس کے برخلاف اورنگ زیب عالمگیر اور دیگر مسلم حکمرانوں نے مندروں کو جاگیریں اور جائیدادیں دیں، ان کے تقدس کو قائم رکھنے کی کوشش کی، صرف اورنگ زیب کو لیجئے تو انھوں نے اپنی حکومت کی یہ پالیسی رکھی کہ مندروں اور مٹھوں کے لیے وظائف مقرر کیے جائیں چنانچہ الہ آباد کے سومیشور ناتھ مہادیو مندر، بنارس کا کاشی وشوناتھ مندر، چترکوٹ کے بالاجی مندر، اومانند مندر گوہاٹی، جین مندر شترونجی اور شمالی ہندستان کے بے شمار مندروں اور گرودواروں کے لیے جاگیریں وقف کی گئیں، اس کی گواہی معروف تاریخی حوالوں میں ملتی ہے، بالخصوص بی این پانڈے نے اس کے ثبوت پیش کیے ہیں اور پروفیسر اوم پرکاش پرشاد نے اپنی کتاب میں اس کی تفصیلات درج کی ہیں۔

مسلم حکمرانوں بشمول اورنگ زیب ومحمود غزنوی نے جن مندروں یا مورتیوں کو تباہ کیا اس کے اسباب کچھ اس طرح کے ہی ہوا کرتے تھے جن کے سبب ہندتوا کی علمبردار حکومت کے دور اقتدار میں بابا گرمیت کے آشرم کی تلاشی لی گئی اور وہاں سے اسباب فساد وبغاوت برآمد کیے گئے، اس کو عیاشی کا اڈہ پایا گیا اور جہاں اندھ بھکتی اور توہم پرستی کی بھینٹ سیکڑوں دوشیزاؤں کی عصمتیں چڑھ گئیں۔

جس طرح بابا کے بلوائیوں نے ملک کے قانون سے بغاوت کی اور ملک کی املاک کو تباہ کیا، اسی طرح اُس دور میں بھی بعض مندروں میں اسباب بغاوت جمع رہتے تھے، لوگوں کی دولت توہمات کی نذر چڑھتی تھی اور اندھی عقیدت کے سبب کسی کو ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، کوئی بھی حکومت اپنے اقتدار کے خلاف ہونے والی کسی کاروائی اور اس میں شامل کسی عنصر کو معاف نہیں کرتی، اورنگ زیب نے بھی یہی کیا، وہ جب گجرات کے صوبے دار تھے تب بھی انھوں نے ایسے مندروں میں کارروائیاں کیں جہاں بغاوت کے عناصر جمع رہتے تھے اور پھر جب حکمراں ہوئے تو بھی یہ کام انجام دیا، مگر اس راہ میں انھوں نے مندر ومسجد کی تمیز نہیں کی، پروفیسر اوم پرکاش لکھتے ہیں:

> ''اس نے (یعنی اورنگ زیب نے) متھرا اور بنارس کے مندروں کو اگر نیست ونابود کروایا تو گول کنڈہ کی مسجد کو بھی برباد کیا کیوں کہ حکومت کے خلاف حرکات وسکنات ان تینوں مقامات پر موجود تھے۔ بنارس کے کاشی وشوناتھ مندر کو توڑنے اور اس پر مسجد بنانے کا الزام اورنگ زیب پر لگایا جاتا ہے جس کا ٹھوس ثبوت نہیں ملتا''۔

(اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، از ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد، ص ۱۸)

اس سلسلہ کا سب سے بڑا الزام اورنگ زیب پر کاشی وشوناتھ مندر کو توڑنے کا ہے، لیکن پروفیسر اوم پرکاش کے مطابق اب تک اس کا ایک بھی معاصر ثبوت نہیں ملا ہے جس سے یہ الزام ان پر ثابت ہو، (اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ص ۲۵)

لیکن ذرا پروفیسر صاحب کے ہی الفاظ میں کاشی وشوناتھ مندر کی تباہی کی کہانی سنتے چلیے جس سے اس کی تباہی اور تباہی کے اسباب پر تاریخی روشنی بھی پڑتی ہے، بابا گرمیت کے ڈیرے کی تباہی کے حقائق واسباب سے اس کی مماثلت بھی نظر آتی ہے اور یہ بھی صاف ہو جاتا ہے کہ بابا گرمیت اور آسارام کا گورکھ دھندا کوئی نیا نہیں بلکہ اس کی جڑیں بہت پرانی ہیں، بلکہ اس دور کے ان ڈھونگی باباؤں کے کرتوت واضح ثبوت اور حقیقت بن کر ان بے بنیاد الزامات کو مسترد کرتی ہیں، پروفیسر اوم پرکاش لکھتے ہیں:

''بنارس کے کاشی وشوناتھ مندر کو توڑنے کے سلسلہ میں پی۔ سیتا رام ناتھ نے نہایت اہم ثبوت پیش کیا ہے جسے بی۔ این پانڈے نے بھی اپنے مضمون میں بطور حوالہ تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ'' کچھ کی آٹھ مہارانیاں کاشی وشوناتھ میں درشن کرنے گئیں۔ ان میں سے ایک حسین رانی کو مہنتوں نے اغوا کر لیا۔ کچھ کے راجہ نے اس واقعہ کی اطلاع اورنگ زیب کو پہنچائی۔ پہلے تو اورنگ زیب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ہندوؤں کا آپسی معاملہ ہے اور اس میں اس کی طرف سے کوئی بھی قدم اٹھانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ لیکن جب کچھ کے راجا نے کافی منت سماجت کی تو اورنگ زیب نے کچھ ہندو سپاہیوں کو واقعہ کی چھان بین اور حقیقت معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ ان سپاہیوں کو مہنت کے آدمیوں نے ڈانٹا ڈپٹا اور مار پیٹ کر بھگا دیا۔ اورنگ زیب کو سپاہیوں کے ساتھ کیے گئے اس برتاؤ پر ناگواری ہوئی۔ اس نے دوبارہ کچھ اہل اور بہتر فوجی جوانوں کو اصل واقعات معلوم کرنے کی غرض سے بھیجا۔ لیکن مندر کے پجاریوں نے اس مرتبہ بھی ڈٹ کر مخالفت کی۔ مغل فوجیوں نے مقابلہ کیا۔ مندر کے اندر فوجیوں اور پجاریوں کے درمیان ہوئی لڑائی کے نتیجہ میں مندر تباہ ہوا، اور لڑائی کی صورت میں ایسا ہونا امکانی بات ہے۔ فوجی جب مندر کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تو انھوں نے گم شدہ رانی کی تلاش شروع کر دی۔ تلاش کے دوران خاص دیوتا (بڑے دیوتا) کے پیچھے ایک سرنگ کا پتہ چلا جس سے انتہائی ناگوار قسم کی بدبو نکل رہی تھی۔ دو دن تک دوا چھڑک کر اس بدبو کو ختم کیا گیا، اور فوجی برابر پہرہ دیتے رہے۔ تیسرے دن فوجیوں نے سرنگ میں گھس کر کئی گلی سڑی لاشیں جو عورتوں کی تھیں وہاں سے برآمد کیں۔ کچھ کی لاپتہ رانی کی لاش بھی ملی جو برہنہ تھی۔ اجتماعی آبروزی کی وجہ سے وہ ختم ہو گئی تھی۔ بڑا پجاری گرفتار کیا گیا اور اسے سخت سزا دی گئی۔'' (اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، از ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد، ص ۲۶-۲۷)

ہم یہاں پر واقعات کی تفصیل میں ہرگز نہیں جانا چاہتے اور نہ ہی یہاں کوئی مکمل تاریخی وتجزیاتی مضمون لکھنا مقصد ہے، اس مضمون سے صرف یہ واضح کرنا ہے کہ مسلم حکمرانوں پر لگنے والے اکثر الزامات بالکل بے بنیاد اور متعصّبانہ تاریخ نگاری نہیں بلکہ تاریخ سازی کا نتیجہ ہیں، مسلم حکمرانوں نے درحقیقت جہاں کہیں بھی کسی کے عبادت خانے پر حملہ کیا تو اس کا سبب یہی تھا کہ وہ جگہ

مرکز بغاوت بن چکی تھی، یا پھر آستھا اور اندھ بھکتی کے نام پر عوام کا استحصال کیا جانے لگا تھا، وہاں آنے والی دولت سَنْتوں کی عیاشیوں کے لیے استعمال ہوتی تھی، توہم پرستی کے ناطے خواتین کی عصمت سَنْتوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھتی تھی اور آنکھوں پر عقیدت کی پٹی چڑھانے والے عوام کی دولت اندر سے کھوکھلے بت میں بیٹھے پجاری کی نذر ہوتی تھی، محمود غزنوی نے سومناتھ مندر پر حملہ کیا، اگر تاریخی طور پر خالی الذھن ہوکر اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ وہ نہ صرف عوام کی دولت چوسنے کا اڈہ تھا بلکہ بغاوت کے عناصر بھی وہاں جمع تھے، پھر توہمات نے غزنوی کو لشکر کشی پر مجبور کر دیا تھا، **بابا گرمیت کے ڈیرے کی سچائی کے سامنے آجانے کے بعد ان واقعات کو اس چشم دید و خود شنید واقعہ کی روشنی میں سمجھنا اور ان کا تجزیہ کرنا چاہیے**، علامہ شبلی نے اس ضمن میں ایک فیصلہ کن جملہ لکھا ہے:

''یورپین اور ہندو مورخ کہتے ہیں کہ عالمگیر نے چوں کہ بت خانے گرائے، اس لیے بغاوت ہوئی لیکن واقعہ یہ ہے کہ بغاوت ہوئی اس لیے بت خانے گرائے گئے'' (اورنگ زیب پر ایک نظر، علامہ شبلی، ص ۴۷)۔

اس جملہ کی تائید و شرح میں منصف مزاج ہندو مورخین کے بیانات اوپر آپ پڑھ آئے ہیں، ان کی روشنی میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرح کے لٹریچر کو، واقعات کو، مختصر رسائل و رپمفلٹ کی شکل میں بڑے پیمانے پر عام کیا جائے اور معاشرے کی فضا کو مسموم ہونے سے بچایا جائے، واقعہ یہ ہے کہ حقائق کے خلاف جس قدر شدت سے پروپیگنڈا مہم چلائی جارہی ہے، اس کے دفاع میں ہماری کوششیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، پھر بھی جو لوگ کام میں لگے ہیں وہ قابل مبارکباد ہیں، اس واقعہ سے حکمت کے ساتھ دعوتی فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے، توہم پرستی پر بھی ضرب لگائی جاسکتی ہے اور آستھا کے نام پر ہونے والے گورکھ دھندوں کو بے نقاب کیا جاسکتا ہے، اب سے کچھ پہلے ایک ٹی وی چینل نے ایک اسٹوری کی تھی اور اس نے مندروں اور آشرموں میں آنے والی دولت کے اعداد و شمار پیش کرنے کے بعد اپنی تعمیری سفارشات بھی پیش کی تھیں جن کو ہوا میں اڑا دیا گیا، وہ ویڈیو اب بھی یوٹیوب پر موجود ہے، (۱) بہرحال مندر ہوں یا درگاہیں اور قبروں کی تجارت کے اڈے، جہاں کہیں بھی عقیدت کے نام پر تجارت شروع ہوجائے اور عوام کا بے جا استحصال ہونے لگے تو اس کا نوٹس لینا ضروری ہے، الحمدللہ ہماری مذہبی تعلیمات اور حقیقت میں ہمارے مذہبی معاملات صاف و شفاف اور دو دو چار کی طرح واضح ہیں، حق بجانب ہیں وہ مدارس و مساجد جن کی جائیدادیں اور جن کی آمدنی کا حساب حکومت سے لے کر عوام تک سب کو معلوم ہوتا ہے اور سب ان کے آمد و خرچ سے واقف ہوتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

(۱) وہ اور اس جیسی دوسری دو ویڈیو کے لنک مندرجہ ذیل ہیں:

Your donation to Temples Dainik Bhaskar Repor: https://youtu.be/t82NN62gUqM

Check out how rich India's temples are!: https://m.youtube.com/watch?v=Kxc5NFnU2rg

Shocking! 50 Lakh Crore of Gold Stored in Indian Temples:https://m.youtube.com/watch?v=aB9QUMHA_UE

❑ پیام سیرت

رنگ لاتی ہے حنا، پتھر پہ گھس جانے کے بعد!

محمد فرید حبیب ندوی

''کیا آپ مجھے ان خونخوار درندوں کے حوالے کردیں گے؟''۔

اس کی آنکھوں میں غم تھا.....آنسو تھے..... چہرے پہ درد کی لکیریں تھیں..... پیشانی پر خوف کے مہیب سایے تھے۔

آنکھوں میں التماس تھا.....رحم کی درخواست تھی۔

چہرہ کی اسکرین پر ماضی کی داستانِ دل خراش تھی۔

دیدۂ چشم اندیشہ ہائے مستقبل کی ترجمانی کررہے تھے۔

پیروں کی بیڑیاں ظالموں کے ظلم کی کہانی سنا رہی تھیں۔

ہاتھوں کی زنجیریں مظلوم کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھیں۔

اور وہ.....درد وغم کی تصویر بنا.....ان سب کے سامنے کھڑا تھا۔

اس کی حالت زار دیکھ کر سب کے کلیجے منہ کو آگئے.....آنکھوں میں خون اور چہرے پہ غصے کی تیز لہر اٹھی.....سب نے جھپٹ کر اسے بیڑیوں کی جکڑ سے آزاد کرانا چاہا.....۔

مگر.....آگے بڑھنے سے پہلے ہی وہ ٹھٹھک گئے..... بڑھتے قدم خود بخود رک گئے.....وہ جس کے اشارے کے غلام تھے، ابھی اس کی طرف سے سگنل نہیں ملا تھا.....اور وہ اس کے اشارے کے بغیر اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتے تھے۔

اور یہی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔

آپ تصور تو کرو.....آپ کے سامنے آپ کے بھائی پر ظلم کے ہتھوڑے برسائے جائیں.....آپ کی آنکھوں کے سامنے اسے مشق ستم بنایا جائے.....کیا آپ خاموش رہ سکتے ہیں.....؟ کیا یہ برداشت کرنے کی سکت ہے آپ میں؟..... جب کہ آپ کے پاس قوت وطاقت بھی ہو.....اور آپ اسے ظالموں کے پنجۂ استبداد سے چھٹکارا بھی دلا سکتے ہوں؟

نہیں ..... کبھی نہیں ..... اگر آپ میں غیرت وحمیت ہوگی.....تو آپ اسے کبھی برداشت نہیں کرسکتے۔

ایسے موقع پر انسان جذبات کا غلام ہوجاتا ہے.....وہ اچھا برا سب بھول کر جذبات کی تلاطم خیز موجوں میں بہتا چلا جاتا ہے۔

مگر وہ لوگ ہی سب سے نرالے تھے.....ان کی شان ہی عجیب تھی!!

وہ جذبات کی رَو میں بہنے کی بجائے ہمیشہ اس کے دامن اطاعت کو تھامے رہتے۔

وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بے بس بھائی کو دیکھ رہے تھے.....اور اندر سے جَلے بھنے جارہے تھے.....مگر پھر بھی خاموش

تھے.....ہاتھوں میں بے کلی اٹھتی.....مگر وہ اسے دبا دیتے.....دل میں ہلچل ہوتی.....مگر وہ اسے ساکن کر دیتے۔

نہ وہ غیرت وحمیت سے محروم تھے.....اور.....نہ ہی قوت وطاقت سے مجبور۔

بس وہ انگلی کے ایک اشارے کے منتظر تھے۔

اگر انہیں ذرا سا اشارہ مل جاتا تو وہ تلوار کی دھار.....سمندر کی رفتار.....اور.....شمشیر وسناں کی تصویر بن جاتے۔

ان کی نظریں اس کے چہرے پہ ٹکی تھیں.....اور وہ ملتمس نگاہوں سے اس سے اجازت کے طالب تھے.....آج ان کے صبر کا بندھن ٹوٹ ٹوٹ رہا تھا.....آج تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ رہا تھا.....مگر پھر بھی وہ صابر تھے.....قابو میں تھے۔

'' دیکھو ! .....تم اسے ہمارے ساتھ جانے دو.....یہ ہماری جماعت میں شامل ہو چکا ہے.....اور یہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا''۔

اس نے فریق مخالف سے اجازت مانگی۔

''نہیں، ہم اسے تمہارے حوالے نہیں کر سکتے.....ابھی تم سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ یہاں کا کوئی شخص تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا''۔

انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

''لیکن ابھی معاہدے کی تحریر مکمل نہیں ہوئی ہے''۔

اس نے پھر مطالبہ کیا۔

'' کچھ بھی ہو جائے.....ہم اسے نہیں دے سکتے''۔

وہ اپنے انکار پہ جمے رہے۔

بس قریب تھا کہ آسمان پھٹ پڑے.....اور زمین میں زلزلہ برپا ہو جائے۔

اور اگر ایسا ہوتا.....تو ان کے طوفان بلاخیز کو روکنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

لیکن یہ کیا !!..... جس کے اشارے پہ طوفان اٹھنا تھا.....وہ خود ساکت تھا.....اور واقعی.....اس کا ٹھہراؤ قابل دید تھا.....ایسے صبر آزما مرحلے میں صبر وتحمل کا دامن تھامے رہنا.....بس اسی کا کمال تھا۔

بجائے اس کے کہ وہ دشمن پر وَار کی اجازت دیتا..... اپنے ہی غلام سے - جو اس کے سامنے پابجولاں پڑا تھا - یوں مخاطب ہوتا ہے:

''ابوجندل! تم ان کے ساتھ ہی چلے جاؤ''۔

''یارسول اللہ ﷺ!.....آپ جانتے ہیں کہ یہ میرے خون کے پیاسے ہیں.....پھر بھی مجھے ان کے ساتھ بھیج رہے ہیں..... آپ مجھے ان خونخواروں کے سپرد کر رہے ہیں؟''۔

''ہاں .....ابوجندل !..... اللہ تمہارے لئے کوئی راہ پیدا کرے گا''۔

یہ منظر دیدنی تھا.....صحابہ کرام کے دل کی جو کیفیت رہی ہوگی.....اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ان کے ایک بھائی کو ان کے ہی سامنے ظالموں کے حوالے کیا جا رہا تھا.....وہ یہ سب دیکھ رہے تھے اور کھول رہے تھے.....اندر ہی اندر ایک ابال تھا.....غصہ تھا .....جوش تھا.....درد تھا۔

یہ چیز ان کی سمجھ سے باہر تھی۔

بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ قوت وطاقت ہوتے ہوئے بھی بے بسی کا مظاہرہ کیا جائے!!

مگر یہ ان کا امتیاز تھا کہ کوئی چیز ان کی سمجھ میں آئے یا نہ

آئے .....وہ اپنے محبوب کی اطاعت سے باہر نہ جاسکتے تھے.....بقول حالی:

بھڑکتی نہ تھی خودبخود آگ ان کی
شریعت کے قبضے میں تھی باگ ان کی
جہاں کردیا نرم، نرما گئے وہ
جہاں کردیا گرم، گرما گئے وہ

ان کا نرم ہونا یا گرم ہونا.....اپنے اختیار سے نہ تھا.....ان کا ہر عمل ان کے محبوب کی مرضی پر موقوف تھا۔

اس لئے.....ایسے سخت مرحلے میں بھی.....جب کہ انسان آپے سے باہر ہوجاتا ہے.....اور کسی کی خیرخواہی اور نصیحت پہ کان نہیں دھرتا.....وہ اپنی مرضی کے وفادار نہ ہوئے .....اسی کے تابعِ فرمان رہے۔

یہ واقعہ ہے صلح حدیبیہ کا.....جب رسول اللہ ﷺ قریش مکہ سے صلح کا معاہدہ کررہے تھے.....اسی دوران حضرت ابوجندل زنجیروں میں جکڑے.....لڑکھڑاتے ہوئے.....مکہ سے بھاگ کر.....جنہیں قریش کے لوگوں نے ایمان لانے کی پاداش میں قیدکررکھا تھا.....یہاں پہنچ گئے.....ابھی معاہدہ مکمل نہ ہوا تھا.....رسول اللہ ﷺ نے سہیل سے جوابوجندل کے والد تھےاور ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے .....[بعدمیں اسلام لائے].....مطالبہ کیا کہ ابوجندل کو ان کے ساتھ جانے دیں.....مگروہ اس پر راضی نہ ہوئے.....معاہدہ کی شق یہ تھی کہ اگر مکہ کا کوئی شخص اسلام لے آئے گا، تواسے مدینہ جانے کی اجازت نہ ہوگی.....رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابھی معاہدہ تکمیلی مراحل تک نہیں پہنچا ہے،اس لئے اس کا حکم ابھی منطبق نہیں ہوگا.....لیکن سہیل نے مان کر نہ دیا.....مجبوراً رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوجندل کوواپس مشرکین کے پاس جانے کا حکم دیا۔

یہ منظر بڑا دردناک تھا.....صحابہ کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی.....وہ یہ دیکھ نہیں سکتے تھے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے ایک بھائی کوظلم کی چکی میں پستا ہوا چھوڑ دیا جائے۔

مگر یہی امتحان کی گھڑی ہوتی ہے ..... اور اسی میں دیکھا جاتا ہے کہ کون اپنے جذبات کی فرمانبرداری کرتا ہے اور کون رسول کریم کی.....اور صحابہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔

اس کے بعد حضرت ابوجندل مکہ واپس ہوگئے.....لیکن جلد ہی اللہ تعالی نے ان کی رہائی کا انتظام فرمادیا.....اور وہ مکہ سے فرار ہوگئے

اس سے یہ سبق بھی ملا کہ ہر تنگی کے بعد آسانی ہے ..... ہرامتحان کے بعدکامیابی ہے.....ہرآزمائش کے بعدسرخ روئی ہے۔

اور یہ کہ امتحان کی بھٹی میں تپے بغیر.....آزمائش کی آگ سے گذرے بغیر.....کامیاب وکامرانی .....اور فتح ونصرت ممکن نہیں۔

موجودہ حالات میں یہ واقعہ ہمیں سبق دیتا ہے کہ اگر:

آج ہم پرظلم کیا جارہا ہے۔

ہمیں ہرطرح ستایا اور پریشان کیا جارہا ہے۔

تو دراصل یہ مستقبل کی کامیابی کی نوید ہے.....اس لئے کہ سرخ روئی مشقت کے بعد ہی ملتی ہے ۔

رنگ لاتی ہے حنا، پتھر پہ گھس جانے کے بعد۔

☆☆☆

❑ ماحولیات

ماحولیات کا تحفظ اسلام کی نظر میں

محمد قمر الزماں ندوی

تمہید:

ماحول کی حفاظت سے خود انسان کی حفاظت ہوتی ہے، اور ماحول کی آلودگی انسانی زندگی کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ جس زمین پر ہم رہ رہے ہیں، آج اس پر غلاظتوں اور گندگی کا اتنا انبار نظر آتا ہے کہ عام انسانی زندگی اس کے تعفن سے اذیت میں مبتلا ہے، تو دوسری طرف جنگلوں اور پیڑوں کے غیر مناسب استعمال بلکہ استحصال نے موسمی تغیرات (Seasonal Changes) کا رخ بدل دیا ہے۔ جس ہوا میں ہم سانس لے رہے ہیں، صنعت گاہوں، کارخانوں، بھٹیوں اور کیمیاوی تجربہ گاہوں کے چھوڑے ہوئے فضلات اور بڑی چھوٹی موٹر گاڑیوں کی کثافتوں سے اس حد تک زہر آلود ہو چکی ہے کہ انسان تنفس، پھیپھڑے، جگر، قلب اور جلد کی بے شمار بیماریوں میں مبتلا ہو رہا ہے۔ پرندے اور جانور بھی اس سے متأثر ہو رہے ہیں، اور جس کے اثرات سے نت نئی بیماریاں جنم لے رہی ہیں۔ سارک کا آسیب جغرافیائی حدود کو پار کر رہا ہے، یہاں تک کہ اوزون کی پرت جو سورج کی شعاعوں کے مضر اثرات سے ہماری حفاظت کرتی ہے اس میں بھی سوراخ ہو گیا ہے، اور جس کی وجہ سے انسانی زندگی کے لئے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ جس پانی کو ہم (انسان) اور سارے حیوانات پیتے ہیں اور کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں، اس میں گندگی کیمیاوی مادوں اور زہریلے فضلات کی ملاوٹ اس کثرت سے ہو رہی ہے کہ پانی کے ساتھ ساتھ انسانی جسم و جان میں بھی زہریلے اثرات منتقل ہو رہے ہیں۔

جنگوں میں آج آتشیں ہتھیاروں، کیمیاوی گیسوں، بارودی دھماکوں، زندگی کش بموں اور لیزر کی شعاعوں کے استعمال نے جہاں نسل کشی میں اضافہ کیا ہے وہیں ماحول پر اور ہر جاندار پر اس کے انتہائی مضر اثرات مرتب ہو رہے، اور زمین کا نمو ختم کر کے اس میں زہر بھر رہے ہیں، اور درجۂ حرارت میں اضافہ کر کے ماحول کا توازن بگاڑ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قدرت کے نظام میں غیر ضروری چھیڑ چھاڑ کر کے اپنے آپ تو تباہی اور بربادی کے دہانے پر پہونچا دیا ہے، اور جس کے نتیجہ میں ہم فضائی، آبی، زمینی، صوتی، سمندری اور شعاعی آلودگی سے دوچار ہیں۔

محمد عربی ﷺ کی دور اندیشی:

آج سے چودہ سو سال پہلے دورِ نبوی ﷺ میں جہاں نہ موٹر گاڑیوں کا وجود تھا اور نہ ہوائی جہاز اور راکٹ کا تصور تھا اور نہ ہی دیو ہیکل کارخانے وجود میں آئے تھے اور نہ اس وقت فضائی، صوتی، آبی اور زمینی آلودگی کا کوئی مسئلہ تھا اس وقت رسولِ عربی محمد

ﷺ نے ماحول کو گندگی اور کثافت سے پاک رکھنے اور فضا کو آلودگی سے محفوظ رکھنے کی تعلیم وتلقین فرمائی، اصولی ہدایات، مؤثر تعلیمات اور عملی اقدامات، تینوں طرح سے ماحول کی پاکیزگی کو یقینی بنایا۔ آپ ﷺ نے انسانیت کو بتایا کہ یہ دنیا انسانوں کے لئے خالق حقیقی کی صناعی کا خوبصورت تحفہ ہے اور اس کی تمام جاندار اور بے جان چیزیں بنی نوع انسان کے لئے حسین اور دلکش نعمت ہیں۔ آپ ﷺ نے اس کائنات کی خوبصورتی، رعنائی، دلکشی اور تابناکی کی حفاظت کی بھرپور تلقین کی اور اسے ترقی دینے میں اپنی صلاحیت وقوت لگانے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا، اور قدرت کے عطیات کو فطری قوانین کے مطابق استعمال کرنے اور برتنے کی نصیحت فرمائی۔

ماحولیات کا تحفظ اور اسلامی تعلیمات: اسلام جو کہ دین فطرت اور معتدل مذہب ہے، اس نے ماحولیات اور قدرتی وسائل کی بقاء وتحفظ کی خاطر مختلف تعلیمات دی ہیں، مثلاً اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی اعتدال سے گزاری جائے وکلوا واشربو ولا تسرفوا (الاعراف:۳۱) اور کھاؤ پیو البتہ حد سے تجاوز نہ کرو۔ ولا تسرفوا إنه لا يحب المسرفين (الانعام:۱۴۱) اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ آنحضرت ﷺ نے آسمان وزمین پہاڑ، حیوانات، نباتات، پرندے، جنگلات، باغات، وادیوں اور آبادیوں سب کچھ کو قدرت کے متوازن نظام کا شاہکار قرار دیتے ہوئے ان کی تخلیق پر غور کرنے، ان کی حکمتوں کو سمجھنے اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تعلیم فرمائی۔

آنحضرت ﷺ نے قدرت کا یہ سبق بھی انسانوں کو ذہن نشین کرایا کہ کائنات میں ان ساری چیزوں کو خاص اہتمام وتوازن اور اعتدال کے ساتھ بنایا اور سنوارا گیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مواقع پر کائنات کے نظم وتوازن اور اپنے مقرر کردہ معیار ومقدار کا حوالہ دیا ہے۔

"إن الله فالق الحب والنوىٰ يخرج الحى من الميت ومخرج الميت من الحى ذلكم الله فانى تؤفكون، فالق الاصباح وجعل الليل سكنا والشمس والقمر حسبانا ذلك تقدير العزيز العليم" (الانعام:۹۵-۹۶)

دانے اور گٹھلی کو (زمین) میں پھاڑنے والا اللہ ہے، وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے، یہ اللہ کے کرشمے ہیں، تم کدھر بہکے جا رہے ہو، رات کے پردہ سے وہی دن نکالتا ہے اور رات کو وجہ سکون بنایا ہے، اور شمس وقمر کی گردش مقرر کی ہے، یہ اسی غالب اور علم رکھنے والے اللہ کے ٹھہرائے ہوئے اندازے ہیں۔

آپ ﷺ نے یہ تعلیم بھی دی کہ کھلے عام گندگی نہ پھیلائی جائے تاکہ فضا مکدر اور مسموم نہ ہو، آپ ﷺ نے بلغم تھوک وغیرہ دفن کرنے کا حکم دیا، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مسجد کے اندر بلغم جھاڑنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کر دینا ہے۔'' (صحیح مسلم حدیث نمبر ۵۵۲)۔

ایک دوسری روایت ہے:

''مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کرنا ہے۔''

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''مجھ پر میری امت کے اچھے برے اعمال پیش گئے تو میں نے

اس کے اچھے اعمال میں سے یہ عمل دیکھا کہ تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹا دیا گیا ہو، اور اس کے برے اعمال میں سے یہ عمل دیکھا کہ مسجد میں بلغم ہو اور اسے دفن نہ کیا جائے۔ (صحیح مسلم حدیث نمبر ۵۵۲)۔

مذکورہ احادیث سے یہ نہ خیال کیا جائے کہ یہ شناعت وقباحت صرف مسجد کے لئے خاص ہے بلکہ ہر عمومی جگہ کا یہی حکم ہے البتہ مسجد کی تخصیص مزید شناعت وقباحت بیان کرنے کے لئے ہے۔

پانی کو آلودگی سے بچانے کے آپ ﷺ نے بہت ہی موثر اور منصفانہ تعلیم دی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تین لعنت کا سبب بننے والی جگہوں سے بچو (۱) پانی کے گھاٹ پر پاخانہ کرنے سے (۲) راستہ میں پاخانہ کرنے سے (۳) سایہ دار جگہوں میں پاخانہ کرنے سے۔'' (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۲۶)۔

آپ ﷺ نے گھاٹ، نہر، نالہ اور ندی کے کنارے رفع حاجت سے اس لئے منع فرمایا کہ نجاست کے اثرات پانی میں پہنچ کر پانی کو آلودہ کر دیں گے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت فرمائی آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اس پانی میں پیشاب نہ کرے جو ٹھہرا ہو، پھر اس میں غسل کرے''۔ (بخاری شریف حدیث نمبر ۲۳۹) چونکہ ٹھہرے ہوئے پانی میں آلودگی پیدا ہونے کا زیادہ خطرہ ہے۔ اس لئے آپ ﷺ نے بطور خاص اس کا تذکرہ فرمایا۔ اور بہتے ہوئے پانی میں بھی پیشاب کرنے کی صریح ممانعت حدیث میں موجود ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے بہتے ہوئے پانی میں پیشاب کئے جانے سے منع فرمایا۔'' (المعجم الاوسط للطبرانی حدیث نمبر ۱۷۴۹)

آپ ﷺ نے اس اہتمام کے ساتھ پانی آلودہ کرنے سے اس لئے منع فرمایا کیوں کہ پانی پر تمام جاندار اجسام کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اور طبی نقطۂ نظر سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ جسم میں پانی کی کارکرگی کا حصہ دوسری چیزوں کے مقابلے میں ۹۰ فیصد زیادہ ہے، غذا اور ہوا بھی پانی ہی کے ذریعہ جسم میں تحلیل کے عمل سے گزرتی ہیں بلکہ جسم کے ظاہر و باطن سے نقصان دہ عناصر کو دور کرنے کے لئے بھی پانی کی کارکردگی اہمیت رکھتی ہے، جب کہ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ پانی ایک آفاقی محلول (Solution) ہے جس میں کوئی بھی آلودہ ہوجاتا ہے۔ (مستفاد ماہنامہ زندگی نو اکتوبر ۲۰۱۳ء)

آپ ﷺ نے تو امت کو یہ تعلیم بھی دی کہ نیند سے بیداری کے وقت ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں نہ ڈبوئے، کیوں کہ میلے ہاتھ پانی کو آلودہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی بیدار ہو تو وہ اپنا ہاتھ برتن میں نہ ڈبوئے، یہاں تک کہ اسے دھولے، کیوں کہ اسے معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ جسم کے کس حصہ پر پڑا'' (صحیح بخاری حدیث نمبر ۱۶۲)

پانی کو آلودگی سے بچانے کے لئے آپ ﷺ نے امت کو یہ تعلیم بھی دی کہ پینے کے برتن میں سانس نہ لی جائے۔ چنانچہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے برتن میں سانس لینے سے منع فرمایا۔ (صحیح البخاری حدیث نمبر ۱۵۳) اہل علم نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ برتن میں سانس لینے یا پھونک مارنے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ تھوک اور منہ کی تری سے کچھ ظاہر ہوکر پانی میں گر جائے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی

پینے والے کے منھ میں بدبو ہو جو پانی کے لطیف ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ چپک کر گھل مل جائے اور اس طرح پانی آلودہ ہو کر متغیر ہو جائے اور طبیعت سلیمہ کو اس کے استعمال سے تنفر ہو۔ (ماحولیات کا تحفظ اسلام کی نظر میں ماہنامہ زندگی نو اکتوبر ۱۳ء)

الغرض مذہب اسلام نے ماحولیاتی آلودگی، فضائی آبی اور صوتی بلکہ ہر طرح کی آلودگی سے گرد و پیش اور ماحول کو پاک رکھنے کی تاکید کی ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک تاکید فرمائی کہ آپ ﷺ نے پیڑ پودوں کو لگانے کی صحابہؓ کو ترغیب دی اور اس کی اہمیت کا احساس دلایا، حضرت انسؓ بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو مسلمان شخص کوئی پیڑ لگاتا ہے یا کاشتکاری کرتا ہے اور اس پیڑ پودے سے انسان، پرندے یا جانور کھاتے ہیں تو یہ پیڑ لگانے والے کے لئے صدقہ ہے۔'' شجر کاری کو آپ ﷺ نے اتنی اہمیت دی کہ قیامت تک اس کام کو کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر قیامت کا وقت آجائے اور تم میں سے کسی شخص کے ہاتھ میں کھجور کا پودا ہو اور قیامت کے برپا ہونے سے پہلے وہ اسے لگا سکتا ہے تو اسے ضرور لگا دینا چاہیے کیوں کہ اسے شجر کاری پر اجر ملے گا۔ (عمدۃ القاری بحوالہ ترجمان الاسلام سہ ماہی جولائی۔ستمبر ۲۰۰۳)

ان احادیث سے بآسانی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسلام نے ماحول کی حفاظت کرنے اور فضا کو خوش گوار رکھنے کا کتنا اہتمام کیا ہے، ان ہی احادیث کو اور نصوص شرعیہ کو سامنے رکھ کر فقہاء اور اہل علم نے ایسے تمام امور سے منع کیا ہے جن سے آلودگی و کثافت پیدا ہوتی ہے، جیسے راستوں اور آبادیوں کے درمیان قضاء حاجت کرنا، گھر سے باہر کھلی نالیاں نکالنا، صاف جمع شدہ پانی میں گندگیوں کا اخراج، آبادی کے درمیان بھٹی اور چمنیاں قائم کرنا، گاڑیوں میں (مٹی تیل) کر اسن تیل کا استعمال، بے جا طور پر لاؤڈ اسپیکر کا استعمال وغیرہ۔

اب ہم اس سلسلے میں اکیڈمی (اسلامک فقہ اکیڈمی) کی جانب سے موصول سوالات کے جوابات بالترتیب تحریر کر رہے ہیں، ماحولیات کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کا لب لباب اگر چہ سطور بالا میں ذکر کر دیا گیا ہے۔ عارضین عرض مسئلہ کے وقت اور قارئین مقالہ کی خواندگی کے وقت تمہیدی اور تعارفی گفتگو پر ضرور ایک نظر ڈال لیں۔

آلودگی پیدا کرنے والے ایندھن کے استعمال کا حکم:

جس ایندھن کے استعمال سے ماحول آلودہ اور پراگندہ ہوتا ہے، اور جو ایندھن دھواں زیادہ چھوڑتا ہے، اور جس سے اجتماعی ضرر پیدا ہوتا ہے اگر انسان کے پاس اس کے مقابلہ میں وہ ایندھن دستیاب ہے جو اگر چہ نسبتاً مہنگا ہو، مگر اس میں دھواں کم ہو، تو ایسی صورت میں جو افراد صاحب ثروت اور صاحب حیثیت ہیں ان کے لئے ایسے ایندھن کا استعمال درست نہ ہوگا جس سے اجتماعی ضرر پیدا ہوتا ہو، اگر چہ ان حضرات کے لیے دوسرا ایندھن خریدنے میں کچھ زیادہ روپے صرف ہوتے ہوں کیوں کہ شریعت کا قاعدہ ہے: "دفع المضرة اولیٰ من جلب المنافع".

قرآن میں صاف اور صریح لفظوں میں تاکید کی گئی ہے کہ ماحول میں فساد برپا نہ کرو، ارشاد خداوندی ہے: "ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها" اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ مچاؤ۔

ڈاکٹر سعود عالم قاسمی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''فساد

اور اصلاح قرآن کریم کی دو اہم اصطلاحیں ہیں جو بڑی معنی خیز ہیں، اصلاح کے معنی آرڈر، نظام اور توازن کے ہیں، یعنی ہر چیز کو اپنی فطری جگہ قائم رکھنا، اور فساد کے معنی بگاڑ، انتشار اور خلل کے ہیں، یعنی کسی نظم میں خلل اور بگاڑ پیدا کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے کائنات میں ہر چیز اندازے، قرینے، اہتمام اور اعتدال کے ساتھ رکھی ہے، اس میں بے راہ روی اور بداعمالی سے خلل نہ ڈالو، بگاڑ نہ پیدا کرو، اس کا استعمال صرف خواہش کے مطابق نہیں بلکہ قدرت کے اصولوں کے مطابق کرو، ماحول کے اس نظم وتوازن کا فائدہ خود انسان کو ہوگا۔ اور اگر وہ اس میں بگاڑ پیدا کرے گا تو اس کے نقصانات اور مضر اثرات بھی اسی کو بھگتنے پڑیں گے، اس طرح انسان اپنی تباہی کا آپ ہی ذمہ دار ہوگا۔ ارشاد خداوندی ہے: ''خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا ہے لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے تاکہ ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے شاید کہ وہ باز آئیں''۔ فساد کا ایک عمومی مطلب تو یہ ہے کہ انسانوں نے اپنے باغیانہ خیالات اور سرکشی اور باہم تنازع وتصادم کرکے زمین میں فساد برپا کرلیا ہے، اس آیت کا ایک اہم مصداق ماحول بھی ہے جس کے لئے خاص طور پر زمین کے ساتھ دریا وسمندر کا تذکرہ کیا گیا ہے، یعنی ماحول میں آلودگی، فکر وخیال اور اعمال کی گندگی، بداخلاقی اور کج روی کی وجہ سے بھی ہے اور قدرت کے عطیات کے غلط استعمال اور استحصال اور ان میں انسانی کثافتوں کی آمیزش کی وجہ سے ہے، ماحول کی آلودگی جبھی دور ہوسکتی ہے کہ انسان اپنے فکر وعمل کا قبلہ درست کرے اور کائنات کے تعلق سے اپنے رویہ میں مثبت تبدیلی لائے''۔ (سہ ماہی ترجمان الاسلام جولائی ستمبر ۲۰۰۳ء)

اگر عہد نبوی میں کثافت پھیلانے والے اس طرح کے ایندھن کا استعمال ہوتا تو یقیناً آپ ﷺ ان کے ضرر سے ماحول کو بچانے کے لئے متعین ہدایات فرماتے۔ آپ ﷺ کے عہد میں ایندھن سے پیدا ہونے والی کثافت کا مسئلہ نہیں تھا لوگ زیادہ تر کھجور اور دودھ استعمال کیا کرتے تھے، پکی ہوئی چیزوں کا استعمال آج کی طرح نہیں تھا چولھے کا استعمال بھی اس کثرت سے نہیں ہوا کرتا تھا، آبادیاں کم تھیں، ماقبل صنعتی عہد میں ماحول کی آلودگی ابتدائی اور سادہ شکل میں پائی جاتی تھی۔ لہذا آپ ﷺ نے اس کے بارے میں انسانی شعور کو بیدار کیا اور عملی اقدامات سے متعلق واضح ہدایات فرمائیں یہ ہدایات آج بھی ماحولیات کے تحفظ اور پاکیزگی کے لئے رہنما خطوط اور سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

لہذا حکومتِ وقت کو چاہیے کہ وہ اصحاب ثروت لوگوں کو قانون اور ضابطے کا پابند بنا کر ایسے ایندھن کے استعمال کا مکلّف بنائے جن میں دھواں کم نکلتا ہو اور جو ماحول کو کم کثیف کرتا ہو اور حکومت اس ذمہ داری کو بھی محسوس کرے کہ غریب لوگوں کے لئے ایسے ایندھن کا رعایتی قیمتوں میں انتظام کرے، اور ان کے لئے اس کی فراہمی کا نظم کرے۔

میری نظر میں حکومت اگر اصحاب ثروت کو اس کا مکلّف بنا دے تو پھر ان کے لئے زیادہ دھواں دینے والے ایندھن کا استعمال جائز نہیں ہوگا اور اس حکم کو ماننا اور اس کی خلاف ورزی نہ کرنا عوام الناس کی ذمہ داری ہوگی۔

کیا حکومت کو کم آلودگی پیدا کرنے والے ایندھن کو لازم اور نافذ کرنے کا حق ہے ؟: یہ حقیقت ہے کہ آمدورفت کے لئے اور سامان کے نقل وحمل کے لئے گاڑیاں اہم اور بنیادی ضرورت میں سے ہیں، انسان

جن سواریوں کو استعمال کرتا ہے وہ گاڑیاں ایندھن سے چلتی ہیں، عصر حاضر میں ماحول کو کثافت سے بچانے کے لئے شمسی توانائی کو قابل استعمال بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، تاکہ ماحولیات کا نظام بگڑنے نہ پائے، سب سے زیادہ دھواں ڈیزل میں، اس سے کم پٹرول میں اور اس سے کم گیس میں خارج ہوتا ہے۔

اگر ماحول کو کثافت سے بچانے کے لئے اور عوام الناس کے مفاد میں مثلاً عوام الناس کو آج کی خطرناک اور مہلک بیماریوں سے بچانے کے لئے (جو بیماریاں عموما فضائی اور ماحولیاتی آلودگی سے پیدا ہوتی ہیں) حکومتِ وقت اگر کسی علاقہ میں اور کسی شہر یا صوبہ میں ڈیزل کے استعمال پر پابندی لگادے، یا کسی خاص گاڑی کے لئے CNG گیس وغیرہ لازم کردے تو عوام الناس کے لئے حکومت کے حکم اور آرڈر پر عمل کرنا شرعاً اور قانوناً واجب ہوگا، اور جو شخص حکومت کے بنائے ہوئے نظام اور قانون کی مخالفت کرے گا وہ مجرم شمار ہوگا۔ حکومتِ وقت کو اس کو سزا دینے کا حق ہے، اس پر جرمانہ لگانے اور عدم ادائیگی کی صورت میں جیل بھیجنا بھی حکومت کے لئے جائز ہوگا۔

میری نظر میں تو اگر حکومت سے کوئی ہدایت اور آڈر نہ ملے، تب بھی لوگوں کو چاہیے کہ ماحول کو کثافت سے بچانے اور صاف وشفاف رکھنے کے لئے کم آلودگی والے ایندھن کو ترجیح دیں، اس کے لئے ماحول ساز گار کریں، سماجی اور فلاحی ادارے اور تنظیمیں پیش پیش رہ کر عوام الناس کو ترغیب دیں اور یہ باور کرائیں کہ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے، حکومتِ وقت کو سماجی اور فلاحی ادارے باخبر کریں کہ فضائی اور ماحولیاتی اور صوتی آلودگی کے لئے موثر ٹھوس قانون اور ضابطہ بنائے۔ دوسری طرف حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ CNG یا اس طرح دیگر گیس جن میں کم دھواں ہو اس کو مناسب اور رعایتی قیمتوں میں عوام الناس کو ہر جگہ مہیا کرائے۔

کیا شرعاً کم دھواں پیدا کرنے والے ایندھن کا استعمال واجب ہوگا؟: شریعتِ اسلامیہ کا مزاج ومذاق "لا ضرر ولا ضرار" اور، "لا یظلمون ولا یظلمون" پر ہے اور شریعت کے مقاصد خمسہ میں سے ایک حفظ جان ونفس بھی ہے۔ اس لئے روشنی کے حصول کے لئے ایسے ذرائع کا استعمال جو بہت دھواں چھوڑتے ہوں، ان سے گریز کرنا ضروری ہوگا۔ اور جن علاقوں اور شہروں میں حکومت کی طرف سے ایسے ایندھن کے استعمال پر پابندی ہو وہاں ایسے ایندھن کا استعمال قانوناً جرم ہوگا۔ اور حکومتِ وقت کو ایسے افراد اور جرنیٹر آپریٹر کے خلاف قانونی کاروائی کا پورا حق حاصل ہوگا۔ ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لئے شرعاً کم دھواں پیدا کرنے والے ایندھن کا استعمال واجب ہوگا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف قاموس الفقہ جلد چہارم میں لکھتے ہیں: ''شریعت اسلامی کا اصل منشا دنیا وآخرت کی مصالح کی تکمیل اور مضرتوں کا ازالہ ہے، وہ انسانیت کے لئے بوجھ نہیں بلکہ رحمت ہے۔ اسی لئے اسلام نے زندگی کے ہر شعبہ میں ضرر ونقصان سے بچانے اور مطلوبہ مصلحتوں کو پورا کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور کتاب وسنت کے اس مزاج کو فقہاء نے بھی ہر جگہ برتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مشہور قاعدہ فقہیہ ہے الضرور یزال یعنی نقصان کو دور کیا جائے گا۔ اس قاعدہ کی اساس رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے لا ضرر ولا ضرار (ابن ماجہ ۲۳۴۰) ابتداءً نقصان پہنچایا جائے اور نہ ردعمل میں۔ (قاموس الفقہ جلد ۵ صفحہ ۳۱۰)

"لا ضرر ولا ضرار" اس حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں

اجتماعی اور انفرادی ضرر کو کیسے دور کیا جائے اس سلسلے میں فقہاء نے سینکڑوں مسائل حل کئے ہیں۔ اور متعدد ضابطے اور قاعدے وضع کئے ہیں جن سے اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً فقہاء کے یہاں قاعدہ ہے "الضرر الاشد یزال بالضرر الأخف" کم تر نقصان کو گوارہ کر کے بڑے نقصان سے بچایا جائے گا۔ کم دھواں پیدا کرنے والا ایندھن اگر چہ قیمتاً مہنگا ہو لیکن اس کو خریدنے اور استعمال کرنے کا حکومت عوام الناس کو مکلّف بنا سکتی ہے کیوں زیادہ دھواں دینے والا ایندھن اگر چہ سستا ملتا ہے لیکن اس کے استعمال سے ماحول بہت زیادہ پراگندہ ہوتا ہے اس لئے یہاں الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف کے قاعدے پر حکومت عمل کرواسکتی ہے۔ اور لوگوں کو چاہیے کہ حکومت کے اس فیصلے کو تسلیم کریں اور حکومت کا ساتھ دے کر اپنے کو ایک سچا اور مخلص شہری ثابت کریں۔

فقہاء نے اس جیسے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے حدیث نبوی "لا ضرر ولا ضرار" سے اسی جیسے ایک اور قاعدہ کا استنباط کیا ہے "إذا تعارج مفسدتانِ اوعی اعظمها ضررا بارتكا اخفها" ''جب دو مفاسد متعارض ہوں تو کم تر ضرر کا ارتکاب کر کے بڑے ضرر سے بچایا جائے گا۔

آلودگی سے محفوظ شمسی توانائی کے استعمال کا حکم: عصرِ حاضر میں فضائی اور ماحولیاتی آلودگی نیز ماحول کو کثافت سے دور رکھنے کے لئے شمسی توانائی کا استعمال کافی بڑھ رہا ہے، حکومتِ وقت اس کے لئے بعض سہولتیں بھی فراہم کر رہی ہے عوام الناس پر شمسی توانائی کے استعمال میں ایک بار بھاری بھر کم بوجھ تو پڑتا ہے لیکن آئندہ وہ برقی بل سے بچ جاتے ہیں۔ میری نظر میں صاحب استطاعت افراد، مساجد و مدارس اور اداروں کے لئے آلودگی سے محفوظ اس توانائی کا استعمال مستحسن ہوگا۔ حکومتِ وقت کو چاہیے کہ تعلیمی اداروں اور دینی و مذہبی اداروں کے لئے خصوصی رعایات کا نظم کرے اور وہ بچے جو مستقبل کے معمار بننے والے ہیں ان کے لئے مناسب اور سازگار ماحول فراہم کرے۔

شریعت اسلامی کا عمومی مزاج یہ ہے کہ عام ضرر کو دور کرنے کے لئے بہت سے شرعی مسائل میں ضرورت و حاجت کے وقت ضرر خاص کو گوارا کیا جائے گا یعنی اجتماعی دیوار شاہ راہ عام کی طرف گر رہی ہو تو مالک دیوار کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اسے توڑ دے کہ گو اس میں اس شخص کا ذاتی طور پر نقصان ہے مگر اس کے ذریعہ اجتماعی مضرت کو دور کرنا مقصود ہے، اسی طرح جاہل طبیب کو علاج سے روکا جائے گا کہ اس سے عام لوگوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس طرح کے سینکڑوں فقہی مسائل ہیں جن میں فقہاء نے اجتماعی مصالح کو شخصی مفادات پر ترجیح دی ہے، تفصیل اس کی الاشباہ والنظائر لابن نجیم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ایسے مواقع پر فقہاء کرام قرآنی حکم "لا یظلمون ولا یظلمون" اور حدیث نبوی ﷺ "لا ضرر ولا ضرر" اور اس قرآنی اور نبوی ضابطے سے مستفاد فقہی قواعد "الضرر یزال" "یتحمل" الضرر الخاص لأجل دفع الضرر العام"، "الضرر الأشد بالضرر الأخف" اور "المفاسد اولیٰ من جلب المنافع" کو سامنے رکھتے ہیں۔

فقہاء لکھتے ہیں: کم تر نقصان کو گوارا کر کے بڑے نقصان سے بچا جائے اور اس کی مثال یوں دیتے ہیں: ایک شخص کو اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ یا تو دوسرے کو قتل کر دے یا مال برباد کر دے تو اس کے لئے مال کے تلف کرنے کی اجازت ہوگی، قتل کرنے کی

اجازت نہ ہوگی (بدائع الصنائع ۷/۱۸۱) حاملہ عورت کے بطن میں بچہ مرجائے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کاٹ کر نکالا جائے ورنہ ماں کی جان کے لئے خطرہ ہو، تو اس کے لئے ایسا کرنا درست ہے۔ (فتاویٰ قاضی علی الھندیۃ ۳/۴۱۱) شریعت اسلامی میں مفاسد کا دور کرنا مصالح حاصل کرنے پر مقدم ہے۔ اس اصول اور ضابطے کی روشنی میں فقہاء نے لکھا ہے کہ اپنے آپ سے یا دوسروں سے نقصان دور کرنا اور ضرر سے بچنا اور بچانا بمقابلہ کسی مصلحت یا منفعت حاصل کرنے کے زیادہ اہم ہے۔ مثلاً کچھ غیر مسلم قیدیوں کو قتل کرنے سے بہتر ہے کہ مسلمان قیدیوں سے ان کا تبادلہ کرلیا جائے۔ (ہدایہ ۲/۵۶۷) اسی طرح کوئی شخص نماز میں مشغول ہو اور کوئی مصیبت زدہ شخص فریاد کررہا ہو تو نماز توڑ کر اس کو بچانا واجب ہے (مراقی الفلاح ص۲۰۳) (مستفاد قاموس الفقہ ج۴، ص۳۱۰-۳۱۱)۔

کارخانہ کا قیام اور اس کے حدود وشرائط: کارخانوں اور صنعت گاہوں کا قیام موجودہ دور کی ایک ضرورت ہے۔ اس کی اہمیت اور ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے منصوبے میں بعض ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے ان سے جتنا فائدہ پہونچنا چاہیے نہیں پہنچ رہا ہے بلکہ بعض کارخانوں سے انسانی زندگی کو پے در پے خطرات لاحق ہو رہے ہیں۔ بہت سی صنعتیں عام انسانوں کی ضروریات پوری کرنے سے زیادہ عیش وعشرت اور سامان تعیش پیدا کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ ان صنعتوں کے قیام سے صحت کے مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں اس لئے کہ ان میں جو کیمیکل استعمال کیے جاتے ہیں وہ عام طور پر صحت کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں اور بڑے پیمانہ پر فضائی آلودگی پیدا کرتے ہیں۔ ان سے نکلنے والی بھاپ دھواں اور فضلہ پوری فضا کو متأثر کرتا ہے اور اس سے کان، آنکھ، پھیپھڑے اور دوسرے اعضاء رئیسہ متأثر ہوتے ہیں۔ بعض صنعتیں ایسی ہیں جن سے نکلنے والا فضلہ قرب وجوار کی زمین کو اس قدر متأثر کرتا ہے کہ زہر آلود بنا دیتا ہے اور اس جگہ سے نکلنے والا پانی تک استعمال کے قابل نہیں رہتا۔ اس سے بھیانک صورت حال ایٹم کے استعمال کی ہے۔ کیوں کہ اس میں جو مادہ استعمال کیا جاتا ہے اس سے پوری فضا اس قدر مسموم ہوجاتی ہے کہ اس کے اثرات زائل ہونے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔

لہذا ان حقائق کی روشنی میں کارخانہ کے قیام کے لئے ان اصول وضوابط کا لحاظ کرنا از روئے شرع ضروری ہوگا:

(۱) کارخانہ کا قیام بغیر حکومت کی اجازت اور مطلوبہ شرائط کے بغیر جائز نہ ہوگا۔

(۲) حکومت نے جہاں اس کی اجازت دی ہے کارخانہ وہیں قائم کرنا ضروری ہوگا۔ اور جو فاصلہ حکومت نے طے کیا ہے اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

(۳) کمپنیوں کے مالکوں کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ ایسا ایندھن استعمال کریں جو آلودگی پیدا کرنے کا باعث نہ ہو۔

(۵) فضلات کو تحلیل کرنے کی ممکنہ تدبیر اختیار کرنا کمپنی والوں کی ذمہ داری ہوگی۔

(۶) حکومت اس سلسلے میں جو بھی قوانین انسانی مفاد کی خاطر بنائے، ان پر عمل کرنا ضروری ہوگا، خلاف ورزی کی صورت میں حکومت کو کمپنی کے لائسنس کو ضبط کرنے یا منسوخ کرنے کا پورا اختیار ہوگا۔ (**جاری**.....)

☆☆☆

❑ سال نو

نئے ھجری سنہ کا آغاز

تذکرۂ ہجرت نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام

مولانا ابوالکلام آزادؒ

وحدثني يا سعد عنها، فزدني
جنونا، فزدني من حديثك يا سعد!

آج جبکہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں، محرم کی تیرہویں تاریخ ہے۔ پورے تیرہ دن اس واقعہ پر گزر چکے ہیں کہ پچھلا ہجری سال ختم ہو چکا اور نیا سال شروع ہو چکا ہے، لیکن ہزاروں لاکھوں مسلمانوں میں شاید ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جس نے غور کیا ہوگا کہ اس سالانہ اختتام و آغاز میں تاریخ عالم کے کیسے عظیم اور انقلاب انگیز واقعہ کی یاد پوشیدہ ہے؟ وہ عظیم واقعہ، جس کی یادآوری سے بڑھ کر تاریخ اسلام کے کسی واقعہ میں بھی ہمارے لئے عبرت کی عظمت اور موعظت کی سرچشمگی نہیں تھی، جس واقعہ سے بڑھ کر تاریخ اسلام کا کوئی واقعہ بھی ہماری یادداشت سے دور اور ہمارے دل کی اثر پذیریوں سے مہجور نہیں ہوگیا ہے!

جماعتی حافظہ اور اس کا مزاج:

انفرادی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کے اخلاق اور سیرت (کیریکٹر) کا اندازہ اس کے حافظہ کی افتاد سے کرلیا جاسکتا ہے، ایک نیک سیرت آدمی کے حافظہ میں غیر ضروری اور بری باتوں کی یادداشت کے لئے کوئی جگہ نہیں نکل سکتی لیکن ضروری اور اچھی باتیں وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ برخلاف اس کے ایک بداخلاق آدمی کو کتنی ہی کارآمد اور اچھی باتیں سنائی جائیں لیکن اس کے حافظہ میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں نکلے گی، وہ صرف بے کار اور بری باتیں ہی یاد رکھ سکتا ہے۔

یہی حال جماعتوں اور قوموں کے دماغ کا بھی ہے۔ ان کے ادبار و تنزل کی ایک بہت بری نشانی یہ ہوتی ہے کہ جماعتی حافظہ کا مزاج بالکل الٹ جاتا ہے، جو باتیں یاد رکھنی چاہئیں، وہ اس طرح بھلا دی جاتی ہیں کہ بار بار یاد دلانے پر بھی یاد نہیں آتیں، اور جو باتیں بھلا دینی چاہئیں، وہ نہ صرف یاد رکھی جاتی ہیں، بلکہ ان کی یاد آوریوں کا ایسا اہتمام کیا جاتا ہے کہ بھلانے کی کتنی ہی کوششیں کی جائیں، کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں! صدر اول کے مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی زندگی سے موجودہ عہد کے مسلمانوں کی زندگی کا مقابلہ کرو تو اس حقیقت کی سب سے زیادہ واضح مثال سامنے آجائے گی، اس وقت مسلمان اٹھتے بیٹھتے جو باتیں یاد رکھا کرتے تھے، آج کسی کو ان کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا، اور جو باتیں آج کل کی بے شمار تقریبوں، تہواروں، یادگاروں، اور اجتماعوں کے ذریعہ یاد رکھی جاتی ہیں، یہ اس وقت کے کسی مسلمان کے وہم وگمان میں بھی نہیں گزری ہوں گی، اس وقت ان کا حافظہ صرف وہی چیزیں یاد رکھنا چاہتا تھا، جن کی یادداشت میں ان کی قومی زندگی کے لئے عبرت و موعظت تھی۔ آج ہمارا حافظہ صرف وہی باتیں یاد رکھنی چاہتا ہے جن کی یادداشت میں قومی زندگی کے لئے غفلت و اعراض ہے۔ وہ ان چیزوں کو بھول نہیں سکتے تھے جنہیں یاد رکھنا چاہیے۔ ہم ان چیزوں کو بھلا نہیں سکتے جنہیں ہمیشہ کے لئے بھلا دینا چاہیے!۔

سارت مشرقة وسرت مغربا
شتان بين مشرق مغرب!

واقعۂ ہجرت

تاریخ عالم کا اس عظیم واقعہ کی یاد سال کے اس اختتام وآغاز میں پوشیدہ ہے، ہجرۃ نبوی کا واقعہ ہے، کیوں کہ پہلی محرم سے نیا اسلامی سال شروع ہوتا ہے، اور اس کی بنیاد واقعۂ ہجرت پہ رکھی گئی ہے، ہر سال جب ۳۰ ذوالحجہ کا دن ختم ہوتا اور پہلی محرم کا چاند شروع ہوتا ہے، تو وہ اس عظیم واقعہ کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ کر دیتا ہے، یہ فی الحقیقت اس واقعہ کی ایک جاری وقائم یادگار ہے۔

یہ دنیا کی تمام قومی یادگاروں کی طرح قوت کی کامرانیوں کی یادگار نہیں ہے، بلکہ کمزوری کی فتح مندیوں کی یادگار ہے، یہ اسباب وسائل کی فراوانیوں کی یادگار نہیں ہے، بے سروسامانیوں کی کامیابیوں کی یادگار ہے، یہ طاقت اور حکومت کے جاہ وجلال کی یادگار نہیں ہے، محکومی وبے چارگی کے ثبات واستقلال کی یادگار ہے، یہ فتح مکہ کی یادگار نہیں جسے دس ہزار تلواروں کی چمک نے فتح کیا تھا، یہ فتح مدینہ کی یادگار ہے جسے تلواروں کی چمک نے نہیں بلکہ ایک آوارۂ غربت اور بے سروسامان انسان کی روح "ہجرۃ" نے فتح کیا تھا! تم نے بدر کی جنگی فتح اور مکہ کے مسلح داخلہ کی شان وشوکت ہمیشہ یاد رکھی ہے، لیکن تم نے مدینہ کی بے ہتھیار کی فتح فراموش کر دی، حالانکہ تاریخ اسلام کی ساری آنے والی فتح مندیاں اسی اولین فتح میں ایک بیج کی طرح پوشیدہ تھیں، یہی وجہ ہے کہ جب ظاہری فتح مندیوں کے اعلان کا وقت آیا تھا، تو اس وقت اسی معنوی فتح مندی کی یاد لوگوں کو دلائی گئی تھی، ثانی الاثنین اذ هما فی الغار اذ یقول لصاحبه: لا تحزن ان الله معنا! فانزل الله سکینته علیه وایده بجنود لم تروها، وجعل کلمة الذین کفروا السفلی، وکلمة الله هی العلیا، والله عزیز حکیم! (۹:۱۴)

تذکار محرم

اس ہجری سنہ کے ساٹھویں برس کربلا کا حادثہ ظہور میں آیا، یہ حادثہ اس درجہ المناک اور دردانگیز تھا، اور اس کے سیاسی اثرات اس درجہ قوی اور وسیع تھے، کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس کی یاد ایک ماتمی یادگار کی حیثیت اختیار کرتی گئی۔ یہاں تک کہ محرم کے ورود کی تمام یادآوریاں صرف اسی حادثہ کے تذکرۂ وتالم میں محدود ہوگئیں اور دوسرے تمام پہلو یک قلم فراموش کر دیے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ حادثۂ کربلا کی المناکیاں اور عبرت انگیزیاں ناقابل فراموش ہیں، لیکن ہمارے جماعتی ذہن وفکر کی یہ بہت بڑی غفلت ہوگی اگر اس حادثہ کے استغراق میں تذکرۂ واعتبار کے دوسرے پہلو فراموش کر دئے جائیں، یہ سنہ ہجری کے ساٹھویں برس کے ایک واقعہ کی تذکار ہے، لیکن خود سنہ ہجری کے پہلے برس کے تذکار سے کیوں چشم بصیرت بند کر لی جائے؟

سنہ ہجری کی ابتدا:

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں میں متعدد سنہ جاری تھے۔ زیادہ مشہور یہودی، رومی اور ایرانی سنین تھے۔ عرب جاہلیۃ کی اندرونی زندگی اس قدر متمدن نہیں تھی کہ حساب وکتاب کی کسی وسیع پیمانے پر ضرورت ہوتی، اوقات ومواسم کی حفاظت اور یاد داشت کے لئے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے اور اسی سے وقت کا حساب لگا لیتے۔ منجملہ سنین جاہلیۃ کے عام الفیل تھا۔ یعنی شاہ حبش کے حجاز پر حملہ کرنے کا سال۔ عرصہ تک یہی واقعہ عرب کے حساب و کتاب میں بطور سنہ کے مستعمل رہا۔ ظہور اسلام کے بعد یہ اہمیت خود آمد اسلام کے واقعات نے لے لی۔ صحابۂ کرام کا قاعدہ تھا کہ عہد اسلامی کے واقعات میں سے کوئی ایک اہم واقعہ لے لیتے اور اسی سے حساب لگاتے، ہجرۃ مدینہ کے بعد ہی سورۂ حج کی وہ آیت نازل ہوئی تھی جس میں قتال کی اجازت دی گئی تھی: اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا وان الله علی نصرهم لقدیر

(۴۰:۲۲) اس لئے کچھ دنوں تک یہی واقعہ بطور ایک سنہ کے مستعمل رہا۔ لوگ اسے ''سنہ اذن'' سے تعبیر کرتے اور یہ تعبیر وقت کے ایک خاص عدد کی طرح یادداشت کا کام دیتی۔ اسی طرح سورۂ برأۃ کے نزول کے بعد ''سنہ براۃ'' کا بھی بول چال میں رواج رہا، عہد نبوی کا آخری سنہ ''سنۃ الوداع'' تھا، یعنی آنحضرت ﷺ کے آخری حج کا واقعہ جو ''حجۃ الوداع'' کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اور ہجرۃ کے دسویں سال پیش آیا تھا، بعض روایات سے اس طرح کے متعدد سنوں کا پتہ چلتا ہے، مثلاً سنة التمحيص، سنة الترفئة، سنة الزلزال، سنة الاستئناس، بیرونی نے اثار الباقیۃ میں اس طرح کے دس سنوں کا ذکر کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک یہی حالت جاری رہی، لیکن حضرت عمرؓ کی خلافت کا عہد شروع ہوا تو ممالک مفتوحہ کی وسعت اور دفاتر حکومت کے قیام سے حساب وکتاب کے معاملات زیادہ وسیع ہوئے، اور ضرورت پیش آئی کہ سرکاری طور پر کوئی ایک سنہ قرار دیا جائے۔ چنانچہ اس معاملہ پر غور کیا گیا۔ اور سنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت تک واقعۂ ہجرت پر سولہ برس گزر چکے تھے۔

ضرورت کا احساس اور صحابہ کا مشورہ

سنہ ہجری کا تقرر کیوں کر عمل میں آیا؟ کیوں حضرت عمرؓ اور تمام صحابہ کا ذہن اس طرف گیا کہ اسلامی سنہ کی ابتداء واقعۂ ہجرت سے کی جائے؟ یہ تاریخ اسلام کا ایک ضروری اور نتیجہ خیز مبحث تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نظر وفکر سے محروم رہا۔

اس بارے میں متعدد روایتیں منقول ہیں، سب سے زیادہ مشہور روایت میمن بن مہران کی ہے جسے تمام مورخین نے نقل کیا ہے:

رفع الى عمر بن الخطاب صك محله شعبان فقال اى شعبان هو؟ أشعبان الذين نحن نيه، او الاتى؟ ثم جمع وجوه الصحابه فقال ان الاموال قد كثرت وما قسمنا منها غير موقت، فكيف التوصل الى مايضبط به ذلك؟ فقالوا يجب ان يعرف ذلك من الفرس فعندها استحضر عمر الهرمزان وسأله عن ذلك، فقال ان لنا حسابا نسميه "ماه روز" فعربو الكمة وقالوا "مورخ" ثم طلبوا وقتا يجعلونه اولا لتاريخ دولة الاسلام فاتفقوا على أن يكون المبدأ من سنة الهجرة (تاریخ کبیر ذہبی، وتاریخ مقریزی)۔

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک کاغذ حضرت عمر کے سامنے پیش کیا گیا جس میں شعبان کا مہینہ درج تھا۔ حضرت عمر نے کہا شعبان سے مقصود کون سا شعبان ہے؟ اس برس کا یا آئندہ برس کا؟ پھر آپ نے سربرآوردہ صحابہ کو جمع کیا اور ان سے کہا: اب حکومت کے مالی وسائل بہت زیادہ وسیع ہو گئے ہیں، اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس لئے ضرری ہے کہ حساب وکتاب کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہو سکیں۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ ایرانیوں سے مشورہ کرنا چاہیے۔ ان کے یہاں اس کے طریقے کیا تھے؟ چنانچہ حضرت عمر نے ہرمزان کو بلایا۔ اس نے کہا ہمارے یہاں ایک حساب موجود ہے جسے ''ماہ روز'' کہتے ہیں۔ اسی ماہ روز کو عربی میں ''مورخ'' بنالیا گیا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی حکومت کی تاریخ کے لئے جو سنہ اختیار کیا جائے، اس کی ابتدا کب سے ہو؟ سب نے اتفاق کیا کہ ہجرۃ کے برس سے کی جائے۔ چنانچہ ہجری سنہ قرار پایا''۔

ابن حبان نے قرہ بن خالد سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے۔ اس میں ایک دوسرے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ:

حضرت عمر کے پاس یمن سے ایک عامل آیا تھا۔ اس نے کہا لکھنے پڑھنے میں آپ لوگ تاریخ نہیں لکھتے۔ اس طرح کہ فلاں بات فلاں سنہ میں اور سنہ کے فلاں مہینے میں ہوئی؟ اس پر حضرت عمر اور لوگوں کو اس معاملہ کا خیال ہوا۔ پہلے انہوں نے ارادہ کیا کہ آنحضرت کے مبعوث ہونے کے وقت سے سنہ کا حساب شروع

کریں۔ پھر خیال ہوا کہ آپ کی وفات سے شروع کیا جائے۔لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ ہجرۃ سے سنہ کا تقرر ہو‘‘۔

ان روایات کی مزید تشریح امام شعبی کی روایت سے ہوتی ہے جو محبّ طبری نے نقل کی ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ:

ابو موسیٰ اشعری نے حضرت عمر کو لکھا کہ آپ کی جانب سے ہمارے نام خطوط آتے ہیں مگر ان پر کوئی تاریخ نہیں ہوتی، اور یہ وقت وہ تھا کہ عمر نے حکومت کے مختلف دفاتر قائم کر دئے تھے اور خراج کے اصول وقواعد طے پا گئے تھے، اور اس لئے محسوس کر رہے تھے کہ ضبط اوقات کے لئے ایک خاص تاریخ قرار پائے۔ پرانی تاریخیں موجود تھیں لیکن وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ انہیں اختیار کریں۔ ابوموسیٰ اشعری نے لکھا تو انہیں زیادہ توجہ ہوگئی۔ صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ مشورہ میں سب کی رائے یہی قرار پائی کہ ہجرۃ کا واقعہ بنیاد ٹھہرا کر سنہ ہجری اختیار کیا جائے‘‘

ابو ہلال عسکری نے الاوائل میں اور مقریزی نے تاریخ میں حضرت سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے کہ واقعہ ہجرت سے سنہ شروع کرنے کی رائے حضرت علیؓ نے دی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ جمع الناس فسألهم من اى يوم يكتب التاريخ؟ فقال على بن ابى طالب من يوم هاجر رسول الله ﷺ وترك مكه ففعله عمر (كتاب الاوائل قلمى مقريزى طبع ثانى جلد٢ ص٥٦) جب حضرت عمر نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کس دن سے تاریخ کا حساب شروع کیا جائے؟ تو حضرت علی نے فرمایا۔ اس دن سے جس دن آں حضرت نے ہجرت کی اور مکہ سے مدینہ آئے‘‘

یعقوبی نے بھی اسے منجملہ ان امور کے قرار دیا ہے جو حضرت علی نے ارادہ کیا کہ ضبط کتابت کے لئے ایک تاریخ قرار دے دی جائے۔ پہلے انہیں خیال ہوا کہ آنحضرت کی ولادت سے شروع کریں پھر خیال کیا آپ کی بعثت کے واقعہ سے ابتداء کی جائے لیکن حضرت علی نے رائے دی کہ ہجرت سے شروع کرنا چاہیے‘‘۔

قومی سنہ کی ضرورت و اهمیت:

ان روایات کے مطالعہ کے بعد ضروری ہے کہ بعض امور پر غور کیا جائے: سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ حضرت عمر اور صحابہ نے یہ ضرورت کیوں محسوس کی کہ ایک نیا سنہ قرار دیا جائے؟ امام شعبی کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر تاریخ کے تعین و تقرر کی ضرورت محسوس کر رہے تھے لیکن پسند نہیں کرتے تھے کہ دوسری قوموں کی تاریخ اختیار کریں۔ پہلی روایت میں جس میں ہرمزان کو بلانے اور مشورہ کرنے کا ذکر ہے، یہ خوزستان کا بادشاہ تھا اور مسلمان ہو کر مدینہ میں مقیم ہو گیا تھا۔ حضرت عمر کی مجالس شوریٰ میں اس کا بار بار ذکر آتا ہے۔ (بلاذری وطبری وغیرہما) بیرونی لکھتا ہے کہ جب حضرت عمر نے اس سے مشورہ کیا تو اس نے نہ صرف ایرانیوں کا طریقہ ہی بتلایا بلکہ رومیوں کے طریقہ کی بھی تشریح کی۔ ایرانیوں کے یہاں کا آخری سنہ یزدگرد کا سنہ تھا، اور رومیوں کا مشہور سنہ سکندر کی پیدائش سے شروع ہوتا تھا۔ بعض صحابہ کو خیال ہوا کہ انہی دونوں میں سے کوئی سنہ اختیار کر لیا جائے، لیکن حضرت عمر اور دیگر لوگ اس سے متفق نہ ہوئے اس سے معلوم ہوا کہ ایرانیوں اور رومیوں کے سنین مجمع صحابہ میں زیر بحث رہے، اور بعضوں نے اسے اختیار کرنے کی رائے بھی دی، لیکن عام رجحان اسی طرف تھا کہ نیا سنہ مقرر کرنا چاہیے۔

اس حقیقت پر بھی نظر رہے کہ سنہ کی ضرورت اور استعمال کی بڑی جگہ حساب وکتاب کے دفاتر تھے، اور حضرت عمر نے بہ اتفاق صحابہ، دفاتر کے لئے وہی زبانیں اختیار کر لی تھیں جو پیشتر سے مفتوحہ ممالک میں رائج تھیں۔ ایران کے لئے فارسی، شام کے لئے سریانی، اور مصر کے لئے قبطی تھی (مسعودی وبلاذری) ظاہر ہے کہ جب دفاتر کے لئے ایران وشام کی زبانیں اختیار کر لی گئی تھیں، تو قدرتی طور پر سنہ بھی وہی اختیار کر لینا تھا جو ان زبانوں کے حساب و

کتاب میں رائج تھا، اور اس کے قواعد بندھی چلے آتے تھے۔ لیکن حضرت عمر اور صحابہ نے ایسا نہیں کیا۔ ایران اور روم ومصر کی زبانیں اختیار کر لیں، مگر سنہ اپنا قائم کرنا چاہا، غور کرنا چاہیے، اس اجتناب کی علت کیا تھی؟

یہ علت تو قطعاً نہیں ہوسکتی کہ صحابۂ کرام محض قومی تعصب اور تنگ دلی کی بنا پر دوسری قوموں کی اچھی اور کارآمد باتوں سے بھی اجتناب کرتے تھے۔ اولاً تو اس بارے میں خود اسلامی احکام کا یہ حال ہے کہ رکاوٹ کی جگہ صریح ترغیب دی گئی ہے ثانیاً اس عہد کے بے شمار واقعات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے تعصّبات کو اس وقت کے مسلمانوں کی ذہنیت میں کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔ وہ دنیا کے تمام علمی وتمدنی ذخیرہ کو خواہ کسی قوم اور ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنا قومی ورثہ سمجھتے تھے۔ خود اسی عہد میں حضرت عمر نے بے شمار معاملات میں غیر قوموں کے علمی اور تمدنی اصول معلوم کئے ہیں، اور ان میں جو باتیں کارآمد اور ضروری نظر آئی ہیں بلا تامل اختیار کر لی ہیں۔ جب کبھی کوئی ایسا معاملہ پیش آتا، وہ ایرانیوں، رومیوں، اور مصریوں کو بہ اصرار طلب کرتے اور ان سے مشورہ لیتے۔ دفاتر حکومت کی تقسیم، خراج ومحصول کا تعین، اراضی کی پیمائش اور تشخیص، خزانہ کا قیام، حساب کتاب کے اصول وقواعد، اور اسی طرح کے بہت سے معاملات ہیں جن میں ایرانی اور رومی قواعد کا تتبع کیا گیا۔ فقہ کا ایک اہم باب فرائض ہے، یعنی ورثہ کی تقسیم کے اصول وقواعد۔ چونکہ اس کا تعلق فن حساب سے ہے، اس لئے حضرت عمر نے چاہا، اس کے قواعد کی ترتیب ودرستگی کے لئے ایک ماہر حساب سے مدد لی جائے۔ مورخین نے تصریح کی ہے کہ اس غرض سے ایک رومی مسیحی مدینہ میں طلب کیا گیا تھا۔ طلبی کے فرمان میں والی شام کو جو الفاظ لکھے تھے وہ یہ ہیں: "ابعث لنا برومی یقیم لنا حساب فرائضنا" ایک رومی کو بھیجدو تا کہ وہ ہمارے فرائض کا حساب استوار کردے۔ صراط مستقیم حافظ ابن تیمیہ) جب حضرت عمر کو فرائض جیسے شرعی مسئلہ کے حساب میں ایک رومی عیسائی سے مدد لینا ناگوار نہ ہوا، تو ظاہر ہے کہ ایرانی یا رومی سنہ کے اختیار کر لینے میں قومی تعصب کیوں مانع ہوتا جس کا تعلق صرف حساب وتاریخ سے ہے؟ پس یقیناً کوئی دوسری ہی علت ہونی چاہیے جس کی وجہ سے انہوں نے ایرانی اور رومی سنین جیسے مدون ورائج سنہ چھوڑ دیے، اور ایک نیا سنہ از سرِ نو قائم کیا۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم اور تربیت نے صحابۂ کرام کا دماغ جس سانچے میں ڈھال دیا تھا، وہ ایسا سانچا تھا جس میں کوئی دوسرے درجہ کا خیال سما ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ صرف اول درجہ کے خیالات کے لئے تھا۔ بہت ممکن ہے کہ دنیا کے تمدنی علوم وفنون کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی بات علمی طریقوں اور مصطلح لفظوں میں نہ ادا کر سکتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات وہ ایک بات کی علت اس شکل وصورت میں نہ دیکھتے ہوں جس صورت میں آج دنیا دیکھ رہی ہے، لیکن ان کی طبیعت کی افتاد اور ذہنیت کی روش کچھ اس طرح کی بن گئی تھی کہ جب کبھی کسی معاملہ پر سوچ بچار کرتے تھے تو خواہ علت وموجب سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، لیکن دماغ جاتا اسی طرف تھا جو علم وحکمت کے بہتر سے بہتر اور بلند سے بلند پہلو ہوسکتے ہیں۔ یہی معنی ہیں انبیاء کرام کے مقام ''تزکیہ'' کے کہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب الحکمہ (۲:۶۲) یعنی دل ودماغ کی اس طرح تربیت کر دی جاتی ہے کہ ایک موزوں اور مستقیم سانچا ڈھل جاتا ہے۔ اب جب کبھی کوئی ٹیڑھی چیز اس میں رکھی جائے گی، وہ قبول ہی نہیں کرے گا۔ صرف سیدھی اور موزوں چیزیں ہی اس میں سما سکتی ہیں!

اسلام کی تربیت نے صحابہ کے دل وماغ میں قومی شرف وخودداری کی روح پھونک دی تھی۔ قومی زندگی کی بنیادیں جن اینٹوں پر استوار ہوتی ہیں، ان میں سے ایک ایک اینٹ کے لئے ان کے اندر پہچان اور لگاؤ تھا۔ اگرچہ وہ لفظوں اور تعبیروں میں

انہیں بیان نہ کرسکیں۔ جب حضرت عمر نے سنہ اور تاریخ کی ضرورت محسوس کی، تو اگرچہ متمدن اقوام کے سنین رائج ومستعمل تھے، لیکن ان کی طبیعت ان کی طرف مائل نہ ہوسکی۔ اس لئے کہ ایسا کرنا نہ صرف قومی شرف وخودداری کے خلاف تھا، بلکہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ کھودینی تھی۔

قومی زندگی کی بنیادی مقومات میں سے ایک نہایت اہم چیز سنہ اور تاریخ ہے، جو قوم اپنا قومی سنہ نہیں رکھتی، وہ گویا اپنی بنیاد کی ایک اینٹ نہیں رکھتی۔ قوم کا سنہ اس کی پیدائش اور ظہور کی تاریخ ہوتا ہے۔ یہ اس کی قومی زندگی کی روایات قائم رکھتا اور صفحۂ عالم پر اس کے اقبال وعروج کا عنوان ثبت کردیتا ہے۔ یہ قومی زندگی کے ظہور و عروج کی ایک جاری وقائم یادگار ہے۔ ہر طرح کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں لیکن یہ نہیں مٹ سکتی۔ کیوں کہ سورج کے طلوع وغروب اور چاند کی غیر متغیر گردش سے اس کا دامن بندھ جاتا ہے، اور دنیا کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی عمر بھی بڑھتی رہتی ہے۔ آج آگسٹس بکر ماجیت، جلال الدین ملک شاہ، اور اکبر اعظم کے نام ان کے سنین کے اندر ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں، اور ہمارا حافظہ ان سے گردن نہیں موڑ سکتا!

ممکن نہ تھا کہ قومی زندگی کا ایک ایسا اہم معاملہ حضرت عمر اور صحابہ کے سامنے آتا اور ان کا دماغ غلط فیصلہ کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام کی دماغی تربیت غلط ہوجاتی۔ کچھ ضروری نہیں کہ انہوں نے اپنے اس احساس کی کوئی توجیہ وتعلیل بھی کی ہو۔ نتائج تعبیر اور تعلیل سے نہیں بلکہ فعل صحیح سے پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اس کے خلاف میلان پیدا نہ کرسکے۔ وہ باوجود غیر قوموں کی ہر طرح کی علمی وتمدنی چیزیں قبول کرلینے کے ان کا سنہ قبول نہ کرسکے۔ خود بخود ان کی طبیعت کا فیصلہ یہی ہوا کہ قومی سنہ سب سے الگ، اور ایسا ہونا چاہیے جس کی بنیاد اپنی تاریخ کے کسی قومی واقعہ پر ہو۔ انھوں نے اپنے دفتروں کے لئے ایرانیوں اور رومیوں کی زبان لے لی، ان کے حساب وکتاب کے قواعد قبول کرلئے، ان کے حساب کی مصطلحات اور اشارات سے بھی انکار نہیں کیا؛ لیکن سنہ اور تاریخ لینے پر آمادہ نہ ہوسکے۔ یہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ تھی، اس لئے ضروری تھا کہ یہ اپنی ہو، اور اپنے ہی ہاتھ سے رکھی جائے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا، اور اسلام نے جو ذہنیت ان کی پیدا کردی تھی، اسے یہی کرنا تھا!

متاخرین کی تعلیل و توجیہ

افسوس ہے کہ صدر اول کے مسلمانوں کی تاریخ کا چہرہ، متاخرین کی نقاشیوں سے اپنے اصلی خال وخط کھوچکا ہے، ہر عہد کا مورخ در اصل اسی عہد کی دماغی آب وہوا کا مخلوق ہوتا ہے، اس لئے سلف کے واقعات کی تصویر کھینچتے ہوئے اسی رنگ وروغن سے کام لیتا ہے جو اس کے عہد کی آب وہوا مہیا کرسکتی ہے۔ اسلام کی حقیقی اجتماعی زندگی کا اصلی دور صحابہ کرام کے عہد پر ختم ہوگیا، اور اس کے بعد جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، اس دور کی معنوی خصوصیات مفقود ہوتی گئیں۔ متاخرین اہل نظر وقلم کا زمانہ آیا تو یہ وہ وقت تھا، جب صدر اول کی دماغی آب وہوا کی جگہ بالکل ایک مختلف قسم کی فضا نشوونما پاچکی تھی۔ اس لئے ان مصنفوں نے جب اس عہد کے حالات پر قلم اٹھایا، تو بجائے اس کے کہ اس عہد کا ذوق ومزاج پیدا کرکے اس کا مطالعہ کرتے، اپنے عہد کے پیدا شدہ ذوق کے رنگ میں اس کی ہر بات رنگ ڈالی، تاریخ ہی پر موقوف نہیں ہے۔ ہر گوشہ تک اس معاملہ کے اثرات پہنچے۔ حتی کہ فقہ واحکام تک کا گوشہ اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اگر عہد صحابہ سے لے کر آخری عہد تدوین کتب تک کی کتابیں مسلسل موجود ہوتیں، اور صدیوں کی ترتیب کے ساتھ ان پر نظر ڈالی جاسکتی، تو صاف نظر آجاتا کہ صدر اول کے واقعات ومعاملات بعد کے ہر عہد میں نئے نئے لباس بدلتے آئے ہیں، اور ان کی تعبیر والفاظ کی جزئیات میں ہر عہد کی ذہنی خصوصیات کا پرتو موجود ہے۔ مثلاً اگر تیرہ صدیوں کی تیرہ مسلسل تاریخیں موجود ہوتیں، تو تم انگلی رکھ کر بتلا سکتے

کہ صدر اول کے ایک ہی واقعہ نے اپنی جزئیات وصورت میں کس طرح تیرہ مختلف لباس پہن لئے ہیں؟

بطور مثال کے اسی واقعہ پر نظر ڈالی جائے، امام شعبی کی روایت میں صاف موجود ہے ولم یحب التاریخات القدیمة یعنی حضرت عمر ایک تاریخ کے تعین کی ضرورت محسوس کر رہے تھے، مگر پسند نہیں کرتے تھے کہ قدیم تاریخیں اختیار کریں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ کسی دوسری قوم کی تاریخ کا اختیار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور یہ معاملہ ان کی نظر میں ایسا تھا جس کے لئے ضرورت تھی کہ مسلمانوں کی ایک قومی تاریخ قرار دی جائے لیکن بعد کے مورخین نے اپنے ذوق ومیلان طبع کے مطابق اس کی توجیہیں شروع کر دیں۔ واقعہ کی اصلی علت پر تو نظر نہیں گئی۔ نئے نئے معنی پہنانے لگے۔ میں یہاں صرف دو عہدوں کی دو مختلف نظروں کا ذکر کروں گا۔

علامہ مقریزی نے نویں صدی ہجری کے اوائل میں اپنی بے نظیر تاریخ لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: حضرت عمر اور صحابہ نے ایرانی اور رومی تاریخ پسند نہیں کی، کیوں کہ دونوں کے حساب میں کبیسہ تھا۔ (یعنی دورۂ ارضی کی کسر پوری کرنے کے لئے چند سالوں کے بعد مہینوں کے دنوں میں کمی بیشی۔ جس طرح کہ تقویم گریگوری میں ہر چوتھے سال ایک دن کی کمی کر دی گئی ہے) چونکہ اسلام نے ''نسیٔ'' سے روکا تھا، اور کبیسہ پر ''نسیٔ'' کا شبہ ہوسکتا تھا، اس لئے مناسب نہ تھا کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا۔ مورخ موصوف کو یہ دور از کار دقیقہ سنجی اس لئے کرنی پڑی کہ قومی تقویم کی ضرورت واہمیت کے لئے ان کے ذہن میں کوئی جگہ نہ تھی، اور چونکہ اور کوئی معقول تعلیل سمجھ میں نہیں آئی اس لئے ناچار ''نسیٔ'' کی شرعی ممانعت کی وادی میں پہنچ گئے۔ حالانکہ کسی اعتبار سے بھی یہ تعلیل لائق اعتنا نہیں، اول تو یہ ان روایات کے خلاف ہے جو اوپر گزر چکیں، کیوں ان میں تمام قدیم تقویموں کی ناپسندیدگی کا ذکر ہے۔ نہ کہ کسی خاص تقویم کا۔ ثانیاً ''نسیٔ''، مصطلحۂ جاہلیت اور ''کبیسہ''، مصطلحۂ حساب قطعاً دو مختلف چیزیں ہیں۔ جس ''نسیٔ'' کو اسلام نے روکا اور قرآن نے کفر کی زیادتی سے تعبیر کیا، وہ یقیناً قمری مہینوں کی طبعی ترتیب کو اس طرح درہم برہم کر دینا تھا کہ کبھی شعبان، محرم بن جاتا تھا، اور کبھی رمضان، ذوالحج قرار پاجاتا تھا۔ اور جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اعمال وطاعات کے معین اوقات الٹ پلٹ ہوجاتے تھے اور ان کے تقرر وتعین کی اہمیت ومصلحت باقی نہیں رہتی تھی۔ لیکن ''کبیسہ'' بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ اس کا مقصد دوسرا ہے، اور اس کے اجراء کے نتائج دوسرے ہیں۔ اس کا کوئی اثر اس طرح کا مرتب نہیں ہوتا۔ وہ محض اس لئے ہے کہ سال بھر کے تین سو ساٹھ دن قرار دینے کے بعد جو کسر رہ جاتی ہے اسے کچھ عرصہ کے بعد پورا کر دیا جائے تاکہ زیادہ مدت گزرنے کے بعد مہینوں اور برسوں کا فرق نہ بن جائے۔ پس کسی طرح بھی یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ حضرت عمر اور اکابر صحابہ ''نسیٔ'' کی حقیقت سے اس درجہ بے خبر تھے کہ تقویم کے کبیسہ کو بھی ''نسیٔ'' سمجھ لیتے، یا انہیں کبیسہ پر ''نسیٔ'' کا شبہ ہوسکتا۔

یہ نویں صدی کی ابتدا تھی۔ لیکن سو برس کے بعد یعنی ہزارویں صدی کے اوائل میں یہی واقعہ ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی سے تقویم وسنین کے متعلق ایک سوال کیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر اور صحابۂ کرام نے رومی اور ایرانی سنہ اختیار کرنے سے اس لئے اجتناب کیا کہ یہ عیسائیوں اور مجوسیوں کا سنہ تھا اور اسلام نے انہیں روک دیا تھا کہ کفار کا طور طریقہ اختیار کر کے اس کے رواج وقبولیت کا باعث نہ ہوں۔ اب غور کرو۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟ کجا کفار کے طور طریقہ سے اجتناب کا معاملہ، اور کجا یہ معاملہ جو حساب وکتاب کے ایک علمی اصول وقواعد کا معاملہ ہے! حافظ موصوف نے یہ تعلیل کرتے ہوئے عہد فاروقی کی آدھی تاریخ فراموش کر دی، اگر اس قسم کے معاملات میں غیر قوموں

سے اخذ واستفادہ جائز نہ ہوتا، تو حضرت عمر بے شمار معاملات میں ایران وروم کے قدیم انتظامات اور تمدنی طریقوں سے فائدہ اٹھانا کیوں جائز رکھتے؟ یہ صحیح ہے کہ صحابۂ کرام کو غیر قوموں کی بہت سی باتوں سے اجتناب تھا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے بہت سی باتوں کو روکا اور عدم اتباع وتشبہ پر زور دیا، مگر وہ باتیں دوسری ہیں، ان کا محل دوسرا ہے، مقصد دوسرا ہے، اور اثرات دوسرے ہیں۔ اس معاملہ سے اسے کیا تعلق؟

واقعہ ہجرت کا اختصاص:

اس جملہ معترضہ نے بہت طول کھینچا۔ بہرحال اس معاملہ میں پہلی بات جو قابل غور تھی، وہ قومی سنہ کا تقرر اور اس کی اہمیت کا احساس تھا۔ بغیر کسی دور دراز توجیہ کے اختیار کئے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ حضرت عمر اور اکابر صحابہ کی اس پہلو پر نظر تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ قومی زندگی کی تقویم کے لئے قومی سنہ ضروری ہے، اور اس لئے چاہیے کہ یہ باہر سے نہ لیا جائے۔ اندر ہی تیار کیا جائے۔

اس کے بعد دوسرا اہم نقطۂ نظر، واقعۂ ہجرت کا اختصاص ہے۔ اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ سنہ کی ابتداء قرار دینے کے لئے جس قدر بھی سامنے کی چیزیں ہوسکتی تھیں، ان میں سے کسی چیز کی طرف ان کی نگاہ نہ گئی۔ ہجرت نبوی کا واقعہ جو آغاز اسلام کی بے سروسامانیوں اور کمزوریوں کی یاد تازہ کرتا تھا، اختیار کیا گیا، آخر اس کی علت کیا تھی؟

بہتر ہے کہ یہ مبحث آئندہ مجلس پر ملتوی رکھا جائے۔ آج کی مجلس قصد سے زیادہ طولانی ہوچکی ہے، ممکن ہے کہ ایک ہی نشست کی اتنی طوالت بعض طبائع پر شاق گزر رہی ہو۔

واقعۂ ہجرت کا اختصاص:

پچھلی تحریر میں یہ حقیقت واضح ہوچکی ہے کہ عمر اور مجمع صحابہ نے ایک نئے سنہ کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ رومی زندگی کے قیام و تکمیل کے لئے قومی سنہ کی ضرورت تھی، اور اسلام کی تعلیم وتربیت نے ان کی قومی ذہنیت کا جو مزاج پیدا کردیا تھا، اس کا مقتضی یہی تھا کہ اس ضرورت کی کھٹک طبیعتوں میں پیدا ہوتی۔ لیکن اب اس کے بعد معاملہ کا سب سے زیادہ ضروری سوال سامنے آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قومی سنہ کا مبدأ قرار دینے کے لئے سامنے کی جتنی چیزیں بھی ہوسکتی تھیں، ان میں سے کوئی چیز بھی اختیار نہیں کی گئی، اور ایک دور کی چیز جو بہ ظاہر اس غرض کے لئے کوئی مناسبت نہیں رکھتی، ان کے سامنے آگئی، اور اس پر سب کا اتفاق ہوگیا، آخر اس کی علت کیا ہے؟

مسلمانوں کا قومی سنہ قرار دینے کے لئے قدرتی طور پر جو چیزیں سامنے کی تھیں، وہ اسلام کا ظہور تھا۔ داعی اسلام کی پیدائش تھی، نزول وحی کی ابتدا تھی۔ بدر کی تاریخی فتح تھی۔ مکہ کا فتحمندانہ داخلہ تھا۔ حجۃ الوداع کا اجتماع تھا جو اسلام کی ظاہری اور معنوی تکمیل وفتح کا آخری اعلان تھا۔ لیکن ان تمام واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی اختیار نہیں کیا گیا۔ ہجرت مدینہ کی طرف نظر گئی جو نہ تو کسی پیدائش کا جشن ہے، نہ کسی ظہور کی شوکت۔ نہ کسی جنگ کی فتح ہے، نہ کسی غلبۂ وتسلط کا شادیانہ۔ بلکہ اس زمانہ کی یاد تازہ کرتا ہے جب آغاز اسلام کی بے سروسامانیاں اور ناکامیاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ داعی اسلام کے لئے اپنے وطن میں زندگی بسر کرنا بھی ناممکن ہوگیا تھا۔ بیچارگی اور مظلومیت کی انتہا تھی کہ اپنا وطن، اپنا گھر، اپنے عزیز واقارب اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر صرف ایک رفیق غمگسار کے ساتھ، رات کی تاریکی میں، رہسپارِ دشتِ غربت ہوا تھا!

یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاملات میں قدرتی طور پر دوسری قوموں کے نمونے سامنے آیا کرتے ہیں۔ حضرت عمر اور صحابہ کے سامنے بھی یہ نمونے موجود تھے۔ لیکن وہ ان کی تقلید پر آمادہ نہ ہوسکے اور انہوں بالکل ایک دوسری ہی راہ اختیار کی۔

دنیا کے قومی سنین:

قومی سنہ دراصل قوم کی پیدائش اور عراج واقبال کی تاریخ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ قومیں اپنی تاریخ کا سب سے زیادہ اہم اور

بنیادی واقعہ یاد رکھنا چاہتی ہیں۔اس کا دور ہر بارہ مہینے کے بعد ختم ہوتا اور از سر نو شروع ہوتا ہے، اور اس طرح سال نو کی مسرتوں کے ساتھ اس کی تاریخی روایات کی شادمانیاں بھی تازہ ہو جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جس قدر سنہ رائج ہوئے، سب کی بنیاد کسی ایسے واقعہ پر نظر آتی ہے جس سے کسی قومی فتح واقبال کا آغاز ہوا ہے۔ چونکہ اس طرح کا آغاز عموماً کسی بڑے انسان کی پیدائش سے ہوا ہے، یا کسی بڑے بادشاہ کی تخت نشینی سے، یا کسی بڑی جنگ کی فتح اور کسی نئی سرزمین کے قبضہ وتسلط سے۔اس لئے دنیا کے اکثر سنوں کی ابتدا مشاہیر واکابر کی پیدائش اور تخت نشینی ہی سے ہوتی ہے۔ بیرونی نے آثار الباقیہ نامی کتاب صرف سنین وتواریخ کے موضوع پر لکھی ہے، اور اس درجہ کی لکھی ہے کہ آج بھی اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی جا سکتی۔ دوہ دنیا کے تمام سنین کا استقصا کر کے لکھتا ہے ''قوموں کا طریقہ اس بارے میں یہ رہا ہے کہ بانیان حکومت اور مذاہب کی پیدائش، بادشاہوں کی تخت نشینی، انبیاء کی بعثت، ملکوں کی فتح وتسخیر، سلطنت کے انقلاب وانتقال، اور حوادث عظیمہ ارضیہ سے تواریخ وسنین کی ابتداء کیا کرتے ہیں''

قدیم سنوں میں بابلی، یہودی، رومی، مسیحی، ہندوستانی اور ایرانی سنین سب سے زیادہ مشہور ومستعمل رہے ہیں، ان سب کی ابتدا کسی ایسے ہی واقعہ سے ہوتی ہے، بابلی سنہ کی بنیاد بخت نصر اول کی پیدائش پر رکھی گئی تھی، کیوں کہ اس کے ظہور سے بابل کی عظمت کا آغاز ہوا۔ یہودیوں نے پہلے مصر سے خروج کے کے واقعہ پر سنہ کی بنیاد رکھی تھی۔ کیوں کہ اسی واقعہ سے ان کی قومی آزادی کا دور شروع ہوتا تھا۔ پھر جب فلسطین میں یہودی حکومت قائم ہوگئی تو حضرت سلیمان کی تخت نشینی سے بھی سنہ کا حساب کرنے لگے۔ پھر ہیکل کی بربادی کے بعد دوبارہ تعمیر کا واقعہ ظہور میں آیا۔ تو چونکہ اس سے یہودیوں کے اجتماع وتوطن کا نیا دور شروع ہوتا تھا اس لئے اس کی یادآوری کے جذبہ نے تاریخ وسنہ کی صورت اختیار کر لی۔ رومیوں کا سب سے زیادہ مشہور سنہ اسکندری سنہ ہے جو سکندر فاتح کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ پھر آگسٹس کی پیدائش سے نیا سنہ شروع ہوا جس کی فتحمندیوں نے رومی عظمت کا نیا دور شروع کر دیا تھا۔ مسیحی سنہ کا تو نام ہی میلادی ہے۔ یعنی اس کی ابتدا حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کے واقعہ پر رکھی ہے۔

ہندوستان میں جہاں ہر گروہ کے لئے الگ الگ زبان اور الگ الگ پیشہ قرار دیا گیا تھا، وہاں مختلف حلقوں کے لئے مختلف سنہ بھی قرار پا گئے تھے۔ جوتشیوں نے اپنے حساب کے لئے خاص جوتشی سنہ قرار دیا تھا۔ عوام اپنی یادداشت کے لئے الگ سنہ رکھتے تھے۔ حکومتوں اور پادشاہوں کے سنہ ان کے لئے مخصوص تھے، مگر ان سب کی بنیاد کسی نہ کسی ایسے ہی واقعہ پر تھی۔ آخری سنہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا اور آج تک مستعمل ہے، بکرماجیتی سنہ ہے، اور یہ راجہ بکرماجیت کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے، ایرانیوں میں بھی جس قدر سنہ رائج ہوئے، سب کی ابتدا پیدایش، تخت نشینی، اور کسی ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں انتقال حکومت کا واقعہ ہے، اس رسم کی کہ ہر پادشاہ پچھلا سنہ منسوخ کر کے اپنی تخت نشینی کا نیا سنہ جاری کرے اور اسے سنہ جلوس کہا جائے، ایرانیوں ہی نے بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں اور ایرانیوں میں جب جنگ ہوئی ہے، تو ایران کا سرکاری سنہ یزدگرد آخری فرماں روائے ایران کا سنہ جلوس تھا۔

حضرت عمر کا تردد:

ان روایات سے جو پچھلی تحریر میں درج ہو چکی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کو بھی ابتدا میں یہی خیال ہوا تھا کہ آں حضرت ﷺ کی پیدائش یا بعثت کے وقت سے سنہ کی ابتدا کی جائے۔ سعید بن مسیّب اور یعقوبی کی روایت میں ہے کہ آپ نے جب حضرت علی سے مشورہ کیا تو ان کے رائے یہ ہوئی کہ واقعۂ ہجرت سے ابتدا کرنی چاہیے یہ بات آپ کے دل میں اتر گئی اور صحابہ بھی اس سے متفق ہو گئے۔ ابن مہران کی روایت میں ہے کہ مبدء تاریخ کے بارے

میں حسب معمول صحابہ نے مشورہ کیا تھا۔مختلف رائیں لوگوں نے دیں۔ بالآخر سب اس پر متفق ہوگئے کہ واقعہ ہجرت سے ابتدا کی جائے: فاتفقوا علی ان یکون المبدء من الهجرة۔ ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ پر اچھی طرح غور وفکر کیا گیا تھا،اور ہر طرح کی رائیں ظاہر ہوئی تھیں چونکہ سامنے کی صاف بات یہی تھی کہ آنحضرت کی ولادت یا بعثت سے تاریخ شروع کی جائے جو ظہور اسلام کی اصلی بنیاد ہے، اس لئے حضرت عمر کا خیال ابتدا میں اسی طرف گیا۔لیکن معلوم ہوتا ہے کوئی بات اس میں ایسی تھی کہ آپ کی طبیعت کو اس پر انشراح نہیں ہوتا تھا،متردد تھے۔اور حضرت علیؓ نے رائے دی کہ واقعۂ ہجرت سے ابتدا کرنی چاہیے۔ یہ رائے اتنی بہتر اور جچی تلی تھی کہ فوراً حضرت عمر کے دل میں اتر گئی اور تمام اکابر صحابہ بھی اس پر متفق ہوگئے، گویا ایک بھولی ہوئی بات تھی جو سب کے حافظہ میں تازہ ہوگئی۔اب معلوم کرنا چاہیے کہ واقعہ ہجرت کی وہ کونسی مناسبت تھی جس نے حضرت علی کو کہ مدینۂ علم نبوت کے باب اور حکمت وسنت رسالت کے محرم اسرار تھے، اس طرف توجہ دلائی؟ اور پھر وہ کون سی ایسی مشہور ومعلوم خصوصیت تھی، جس کی وجہ سے اتنی دور کی بات تمام اکابر صحابہ کے فہم میں فوراً در آئی،اور اس طرح تسلیم کرلی گئی، جیسے ایک مسلم اور طے شدہ ہو؟

واقعۂ ہجرت صحابہ کی نظر میں:

ہاں، آج ہمارے لئے اسلام کے صدر اول کا دماغ اور روح، دونوں کھو چکے ہیں، یہ بات کتنی ہی تعجب انگیز ہو، مگر صحابۂ کرام کے لئے جو اسلام کے بخشے ہوئے دل اور اس کے بنائے ہوئے دماغ، دونوں کے مالک تھے، یہ بات اتنی صاف، اتنی کھلی ہوئی، اور اس طرح جانی بوجھی ہوئی تھی کہ اس کی طرف صرف ایک اشارہ کر دینا ہی کافی تھا۔داعی اسلام کے تزکیۂ وتربیت اور درسِ کتاب وحکمت نے ان کے اندر ایک ایسا صالح مزاج پیدا کر دیا تھا، کہ کوئی بات خواہ کتنی ہی سامنے کی اور مقبول ومعمول کیوں نہ ہو، لیکن اگر حقیقت اور دانائی کی گہرائیوں سے ذرا بھی ہٹی ہوئی تھی، تو فوراً ان کی طبیعت میں کھٹک پیدا ہو جاتی تھی، اور پھر جمتی تھی تو اسی وقت جب اصلی اور کامل چیز سامنے آجاتی تھی۔تم ان لوگوں کی نیکیاں اور پاکیاں ہمیشہ یاد رکھتے ہو، لیکن تم نے ان کے علم اور دانائی کی گہرائیاں بھلا دی ہیں، حالانکہ صرف ان کے دل ہی زیادہ نیک نہ تھے بلکہ ان کی دانائی وحکمت بھی سب سے زیادہ گہری تھی جیسا کہ خود انہی میں سے ایک حقیقت شناس انسان نے کہا تھا: اولئك اصحاب محمد ﷺ كانوا افضل هذه الامة ابرها قلوبا، واعمقها علما، اقلها تكلفا، اختارهم الله لصحبة نبيه ولا قامة دينه (عن عبدالله ابن مسعود، رواه الدارمی)

اس بارے میں قوموں کا طریقہ ان کے سامنے آیا، اور خود انہیں بھی یہ بات صاف دکھائی دی کہ داعی اسلام کی پیدائش یا بعثت کو اپنی قومی تاریخ کی بنیاد ٹھہرائیں، لیکن چونکہ یہ بات اس معیار نظر سے ہٹی ہوئی تھی جو اس طرح کے معاملات میں اسلام نے قائم کیا تھا، اس لئے نہایت واضح اور نمایاں ہونے پر بھی ان کی طبیعت کو مطمئن نہ کر سکی، وہ ایسا محسوس کرنے لگے کہ کوئی دوسری بات ہونی چاہیے، وہ دوسری بات کیا تھی؟ ہجرت مدینہ کا واقعہ۔جونہی یہ بات سامنے آئی، سب کے دلوں نے قبول کر لی۔تاریخ کا یہ مبدء دنیا کی تمام تاریخوں اور قومی یادگاروں کے خلاف تھا۔صرف خلاف ہی نہ تھا، بلکہ صریح الٹا تھا۔دنیا کی تمام قومیں فتح واقبال سے اپنی تاریخ شروع کرتی تھیں۔انہوں نے بیچارگی ودرماندگی کے واقعہ سے اپنی تاریخ شروع کی۔دنیا کی تمام قوموں نے چاہا اپنے ظہور کی سب سے بڑی فتح یاد رکھیں۔انہوں نے چاہا اپنی تاریخ ظہور کی سب سے بڑی بے سروسامانی یاد رکھیں۔دنیا کی تمام قوموں کا فیصلہ یہ تھا کہ ان کی قومی تاریخ اس وقت سے شروع ہوئی، جب ان کی تاریخ کا سب سے بڑا انسان پیدا ہوا، اور اس نے جنگ وقتال کے میدانوں میں فتح حاصل کی۔لیکن ان کا فیصلہ یہ تھا کہ قومی تاریخ کی ابتدا اس دن سے

ہوئی، جب بڑے انسان کی نہیں بلکہ سب سے بڑے عمل کی پیدائش ہوئی، اور جنگ کے میدانوں میں نہیں بلکہ صبر واستقامت کے میدانوں میں فتح حاصل ہوئی۔ دنیا کی تمام قوموں کا یقین تھا کہ ان کی طاقت وشوکت کی بنیاد اس وقت پڑی، جب انہوں نے ملکوں اور سلطنتوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کا یقین یہ تھا کہ طاقت وشوکت کا دروازہ اس دن کھلا، جب ملکوں پہ انہوں نے قبضہ نہیں کیا، بلکہ اپنا ملک ووطن بھی ترک کر دیا۔ بلاشبہ ان کی یہ سمجھ دنیا کی ساری قوموں سے الٹی سمجھ تھی، لیکن اس سمجھ سے عین مطابق تھی جو اسلام کی تربیت نے ان کے اندر پیدا کر دی تھی، وہ اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر قوموں کی تقلید سے نہیں بلکہ اسلام کی روح فکر وعمل سے کرنی چاہتے تھے۔

مصیبت یہ ہے کہ دنیا معنی سے زیادہ لفظ کی اور روح سے زیادہ جسم کی پرستار ہے۔ وہ پھل ڈھونڈھتی ہے لیکن تخم کی جستجو نہیں کرتی۔ وہ منارۂ ومحراب کی بلندیاں اور خوشنمائیاں دیکھتی ہے، لیکن زیر زمین بنیادوں کے لئے نگاہ نہیں رکھتی۔ صحابۂ کرام نے جب پیدائش وبعثت کے واقعات عظیمہ ترک کر کے ہجرت کا واقعہ انتخاب کیا، تو ان کی نظر بھی پیدائش وظہور، فتح واقبال اور جشن وکامرانی ہی پر تھی۔ وہ کچھ ناکامی ونامرادی کے طلب گار نہ تھے۔ البتہ وہ فتح واقبال کی صورت اور برگ وبار نہیں دیکھتے تھے۔ حقیقت اور تخم واساس پر نظر رکھتے تھے۔ ان پر یہ حقیقت کھل چکی تھی کہ اسلام کی پیدائش وظہور اور فتح واقبال کی اصلی بنیاد ان واقعات میں نہیں ہے جو بظاہر نظر آتے ہیں۔ ہجرت مدینہ اور اس کے اعمال وحقائق میں ہے، اس لئے جو اہمیت دنیا کی نگاہیں پیدائش، بعثت، بدر، اور فتح مکہ کو دیتی تھیں، وہ ان کی نظروں میں ہجرت مدینہ کو حاصل تھی۔

ہجرت نبوی کی حقیقت:

لیکن واقعۂ ہجرت کیا تھا؟ وہ ایک ہی واقعہ نہ تھا۔ بے شمار اعمال ووقائع کا مجموعہ تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی حقیقت پر بھی غور کر لینا چاہیے۔

اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی عہدوں میں منقسم ہے۔ ایک عہد، مکہ کی زندگی اور اعمال کا ہے۔ دوسرا مدینہ کے قیام اور اعمال کا۔ پہلا آنحضرت ﷺ کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا غار حراء کے اعتکاف سے ہوتی ہے اور تکمیل غار ثور کے انزواپر۔ دوسرا ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا مدینہ کی فتح سے ہوئی اور تکمیل مکہ کی فتح پر۔

دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور واقبال کا اصلی دور، دوسرا دور تھا، کیوں اسی دور میں اسلام کی پہلی غربت ختم ہوئی اور ظاہری طاقت وحشمت کا سروسامان شروع ہوا، بدر کی جنگی فتح ہتھیاروں کی پہلی فتح تھی۔ مکہ کی فتح، عرب کی فتح کا اعلان عام بھی۔ لیکن خود اسلام کی نظروں میں اس کی زندگی کا اصلی دور، دوسرا نہیں، پہلا تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں دوسرے میں نہیں پہلے دور میں استوار ہوئی ہیں۔ بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے اپنی غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا۔ لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے، ان کی طاقتیں کس میدان میں طیار ہوئی تھیں؟ بلاشبہ مکہ کی فتح عرب کی فیصلہ کن فتح تھی، لیکن اگر مدینہ کی فتح ظہور میں نہ آتی تو مکہ کی فتح کی راہ کیوں کر کھلتی؟ یہ سچ ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا، لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت اور اس کے دور کے اعمال سے فتح ہوا تھا۔ پس دوسرے دور میں جسم کتنا ہی طاقتور ہو گیا ہو، لیکن اس کی روح پہلے ہی دور میں ڈھونڈھنی چاہیے!

پہلا دور تخم تھا، دوسرا اس کے برگِ وبار تھے۔ پہلا دور بنیاد تھی دوسرا ستون ومحراب تھا۔ پہلا نشوونما کا عہد تھا۔ دوسرا ظہور وانفجار کا۔ پہلا معنی وحقیقت تھا۔ دوسرا صورت واظہار، پہلا روح تھا۔ دوسرا جسم۔ پہلے نے پیدا کیا، درست کیا، اور

مستعد کر دیا۔ دوسرے نے قدم اٹھایا، آگے بڑھا، اور فتح و تسخیر کا اعلان کر دیا۔ دوسرے کا ظہور کتنا ہی شاندار ہو، لیکن اولین بنیاد واستعداد کی عظمت پہلے ہی کو حاصل ہے!

استعداد داخلی و خارجی:

وجود اور زندگی کے ہر گوشہ کے لئے خدا کا قانونِ وجود ایک ہی ہے۔ تم اس کے کتنے ہی مختلف نام رکھ دو مگر وہ خود ایک سے زیادہ نہیں ہے۔ اب ایک لمحہ کے لئے ٹھہرو، اور غور کرو کہ تخلیق و تکمیل وجود کے لئے خدا کا قانون حیات کیا؟

فرد کی طرح جماعت کا بھی وجود ہے۔ عالم صورت کی طرح عالم معنی بھی اپنی ہستی رکھتا ہے، لیکن کوئی چیز ہو، تخلیق و تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ یکے بعد دیگرے دو مختلف دوروں سے گزرے۔ پہلا دور ''استعداد داخلی'' کا ہے۔ دوسرا ''استعداد خارجی'' کا۔ ضروری ہے کہ پہلے اندر کی استعداد میں آئے، اور ضروری ہے کہ اندر کی استعداد کی تکمیل کے ساتھ ہی باہر کی استعداد بھی اس کے اندر پیدا ہو جائے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے مثال کی ضرورت ہے۔ خدا کی رحمت وربوبیت نے تمام کائنات ہستی کو بخشش کا خزانہ اور فیضان عام کی بارش بنا رکھا ہے۔ زندگی اور وجود کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان میں سے ہر چیز موجود ہے، اور اس کی موجودگی صرف اس لئے ہے تا کہ استعداد کو ڈھونڈے، صلاحیت کو پالے، اور انفعال کو فعل سے اور انجذاب کو جذب سے مالا مال کر دے، سورج روز آسمان پر چمکتا ہے۔ ستارے ہمیشہ زمین کی طرف جھانکتے ہیں۔ ہوائیں یکساں گرمجوشی سے چلتی ہیں، بادلوں کی رفتار میں کبھی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ سورج کی کرنیں سمندروں کو کھینچنے اور پانی کے ذخیرے جمع کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتیں۔ زمین کی سطح اپنے سارے خزانے لئے ہوئے موجود ہے۔ خاک کے ذروں میں سے ہر ذرہ اپنا خاصہ اور اپنی تاثیر رکھتا ہے۔ موسموں کی تبدیلی اور لیل ونہار کی گردش بھی اپنے مقصد اور حکمت سے باہر نہیں۔ یہ، اور اسی طرح کی تمام ان گنت اور بے حد وحساب چیزیں:

وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها (۱۴:۳۴) اور اگر تم خدا کی نعمتیں اور بخشائشیں شمار کرنی چاہو، تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی تمہارا اندازہ احاطہ نہیں کر سکتا!

قوتوں کا خزانہ اور بخشائشوں اور ربوبیتوں کا فیضان، عام ہیں، اور اپنی مجموعی صورت میں کائنات ہستی کی وہ ''خارجی استعداد ہے'' جو وجود کے خلق وتسویہ کا سامان مہیا کرتی اور ہمیشہ اس کے انتظار میں چشم براہ رہتی ہے، لیکن خارج کی اس استعداد سے صرف وہی اشیاء فائدہ اٹھا سکتی اور اپنے حصہ کی بخشش پا سکتی ہیں جن کے اندر خود ان کے ''اندر کی استعداد'' وجود میں آ گئی ہے، یہ اندرونی استعداد باہر کے کارخانۂ استعداد کا تاثیر کے لئے بہ منزلۂ انفعال ہے، جب تک انفعال کا لبِ سوال وا نہ ہوگا، فعل وتاثیر کا جوابِ فیضان، حرکت میں نہیں آ سکتا!

دہقان ایک بیج اٹھاتا ہے اور زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ اب دیکھو، ایک ایک بیج کے بارآور ہونے کے لئے قدرت الٰہی نے کس طرح اپنا تمام کارخانۂ ہستی مہیا کر دیا ہے؟ سورج منتظر ہے کہ اپنی گرمی اس کے لئے وقف کر دے، بادل تیار ہیں کہ اپنے ذخیروں کا منہ کھول دیں۔ زمین مستعد ہے کہ اپنی آغوش اس کے لئے وا کر دے، لیکن اس تمام کارخانۂ بخشش سے وہ جبھی فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ خود اس کی استعداد صحیح وصالح ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے، تو پھر یہ تمام کارخانۂ بخشش ونوال اس کے لئے بیکار ہوگا۔ سورج اپنا دہکتا ہوا تنور رکھنے پر بھی اسے گرم نہ کر سکے گا، بادل اگر اپنا تمام ذخیرۂ آب ختم کر ڈالے جب بھی اسے زندگی کی رطوبت کا ایک قطرہ نہیں ملے گا!

پھر ایک صالح بیج جب زمین میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے، تو اس کے اندر کی استعداد ظاہر ہوتی ہے اور اندر ہی اندر پکنے اور بڑھنے لگتی ہے، اس وقت وہ ایک چھوٹا سا وجود ہوتا ہے جس کے اندر باریک

ذروں اور ریشوں کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن انہیں ذروں اور ریشوں کے اندر اس کی آنے والی ہستی کی ساری بڑائیاں اور عظمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، حتی کہ کہا جا سکتا ہے ایک عظیم اور تناور رخت کی ساری ٹہنیاں اور پتے، اور اس کے ہزاروں پھول اور پھل انہیں ذروں اور باریک ریشوں کے اندر موجود ہوتے ہیں، وہ بتدریج نشو ونما پاتا ہے، اور یکے بعد دیگرے تخلیق وتسویہ کے مختلف درجوں سے گزرتا ہے۔ پھر جب یہ سب کچھ ہو چکتا ہے، تو وہ وقت آجاتا ہے جب زمین کی سطح چاک ہوتی ہے اور اس کی پہلی شاخ باہر نکلتی ہے، چنانچہ وہ ابھرتا ہے، اور کائنات فطرت کے جس کارخانۂ فیضان سے زمین کے اندر اکتساب فیض کر رہا تھا، اب اس سے زمین کی سطح پر بخشش ونوال حاصل کرنے لگتا ہے۔ اس وقت تم دیکھتے ہو کہ عالم نباتات کا یہ جوان نو خاستہ سروقد کھڑا ہے، اور کارخانۂ فطرت کے ہر سامان سے زندگی اور قوت کا مطالبہ کر رہا ہے، اب تم اس کی ہستی کا اعتراف کرتے ہو، لیکن تم بھول جاتے ہو کہ باہر کی استعداد اس کے لئے جو کچھ بہم پہنچا رہی ہے یہ دراصل اسی استعداد کا جواب اور نتیجہ ہے جو زمین کے اندر اس کی داخلی طبیعت نے پیدا کر لی تھی!

عالم حیوانات میں دیکھو تو یہ حقیقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، حیوان اور انسان کا جو وجود عالم ہستی میں قدم رکھتا ہے، اور بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی منزلیں طے کرتا ہے، دراصل یہ وہی وجود ہے جو پہلے خود اپنی ہستی کے اندر تخلیق وتکمیل کی منزلیں طے کر چکا ہے۔ اگر اس کی داخلی استعداد کا دور صحت اور قوت کے ساتھ ختم نہ ہوتا، تو اس کی خارجی استعداد کا یہ دور وجود ہی میں نہ آتا۔ وہ پہلے شکم مادر میں جنین کا ابتدائی مادہ تھا، پھر اندر ہی اندر بڑھنے اور پھیلنے لگا، بہ تدریج تخلیق وتسویہ کی مختلف منزلیں وجود میں آئیں پہلے چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے جنہوں نے ایک جونک کی سی شکل اختیار کر لی، پھر یہ جونک بڑھتے بڑھتے گوشت کا ایک لتھڑا بن گئی، لتھڑے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بننا شروع ہوا، اور ڈھانچے پر گوشت پوست کا غلاف چڑھ گیا، پھر گوشت اور ہڈیوں کا یہی مجموعہ نظم وتناسب کے ایک ایسے سانچے میں ڈھل گیا، کہ شکل وہیئت کی تمام باریکیاں اور خال وخط کی ساری دلآویزیاں مکمل ہوگئیں، پھر جب اندر ہی اندر تکمیل وتسویہ کے یہ تمام مراتب طے ہو گئے، تو یہ وجود اس قابل ہوا کہ شکم مادر سے باہر قدم نکالے۔ اور تم نے دیکھا کہ خلقت اور ہستی کا ایک زندہ اور مستعد وجود تمہارے سامنے ہے: ثم انشاناہ خلقا آخر، فتبارك الله احسن الخالقين: (۲۳:۱۴)

بہرحال دنیا میں ہر چیز کی تخلیق وتکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کارخانۂ فیضان فطرت سے اکتساب فیض کی صحیح استعداد پیدا ہو۔ اور اس استعداد کے ظہور کا پہلا محل اندرونی ہے دوسرا بیرونی۔ جب تک کوئی چیز اپنے اس پہلے دور میں صحیح استعداد پیدا نہیں کر لے گی، دوسرے دور کی استعداد پیدا نہیں کر سکتی، خارج کے نشو ونما کے لئے داخل کا نشو ونما، بمنزلۂ سبب وعلت ہے۔ جب تک سبب موجود نہ ہوگا، نتائج ظہور میں نہیں آئیں گے۔

جماعت کی داخلی استعداد:

فرد اور جماعت دونوں کا ایک ہی حال ہے، یہ افراد واشیاء کی مثالیں تھیں، انہیں کو جماعتوں اور قوموں پر منطبق کرو، اشیاء وافراد کی طرح ''جماعت'' بھی پیدا ہوا کرتی ہے۔ اس کی تخلیق، نشو ونما، اور ترقی وتکمیل کے لئے بعینہ وہی قوانین ہیں، جو اشیاء وافراد کے لئے ہیں۔ جس طرح فطرت الٰہی کی ربوبیت نے مخلوقات کی زندگی اور نشو ونما کے لئے اپنی بخشایشوں کے بادل زمین پر پھیلا دیے ہیں، ہر شئے زندگی دینے والی، ہر شے پرورش کرنے والی، اور ہر شیء وجود وکمال تک لے جانے والی ہے، ٹھیک اسی طرح ''جماعت'' اور ''امت'' کے ظہور ونشوء کے لئے بھی ہر طرح کی بخشائشوں اور ہر طرح کی فیض رسانیوں کا سامان مہیا کر دیا ہے، ربوبیت اس کے ظہور کا انتظار کرتی اور بخشایش فطرت اس کے قدم اٹھانے کی راہ تکتی ہے۔ لیکن جس طرح افراد واشیاء کے لئے فطرت

کا تمام سامان فیض صرف اسی حالت میں مفید ہوسکتا ہے جبکہ خود ان کے اندر صحیح و صالح استعداد موجود ہو۔ اسی طرح ''جماعت'' کا مولود بھی وقت کے فیضان اور قومی ماحول کی بخشایشوں سے اسی حالت میں فائدہ اٹھا سکتا ہے، جبکہ خود اس کے اندر اکتساب و انفعال کی صحیح استعداد موجود ہو، پھر جس طرح اس استعداد کی تکمیل کا پہلا مرحلہ داخلی ہے، دوسرا خارجی، اسی طرح جماعتوں اور قوموں کی مزاجی استعداد کے کے لئے بھی پہلا مرحلہ داخلی ہے، دوسرا خارجی، کوئی جماعت کوئی قوم، انسان کی کوئی ہیئت اجتماعیہ، کش مکش حیات کی کامیابیاں حاصل نہیں کرسکتی، اگر پہلے ایک تخم اور جنین کی طرح اپنی داخلی استعداد کی منزل طے نہیں کرلیتی، اس کی داخلی تخلیق و تکمیل کا بھی ایک معین وقت اور وقت کی معین مقدار ہے، اگر ایک جماعت وجود و کمال کا پورا درجہ حاصل کرنا چاہتی ہے، تو ناگزیر ہے کہ پہلے داخلی استعداد کی تکمیل کا وقت بسر کرلے، اس کے بعد خارج کے اعمال وفتوح کا دروازہ خود بخود اس پر کھل جائے گا، کیوں کہ خارج کی تمام کامرانیاں اس کی داخلی استعداد کی تکمیل کا نتیجہ و ثمرہ ہوتی ہیں۔

جس طرح اشیاء و افراد کے جسم کی داخلی استعداد کا دارومداران کے اندر ہی اندر نشو ونما پانے اور اندر ہی اندر پکنے پر ہے، اسی طرح فرد اور جماعت کی دماغی اور اخلاقی استعداد کا دارومداران کی ابتدائی تعلیم وتربیت پر ہے جسے قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں ''تزکیہ'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ''تزکیہ اخلاق ونفس'' سے مقصود یہ ہے کہ ایک جماعت کو بہ حیثیت ایک جماعت کے جس طرح کے ذہن ومزاج کی ضرورت ہے، وہ اس کے ایک ایک فرد کے اندر پیدا کردیا جائے، اور اس رسوخ ونفوذ کے ساتھ پیدا کردیا جائے گویا ایک آہنی کالبُد لے کر ان میں سے ہر فرد کا دل ودماغ اس میں ڈھال دیا گیا ہے۔ جس طرح عالم اجسام میں جسم کی بہتر خلقت اور بہتر نشو ونما طاقت و برتری کا موجب ہوتی ہے، اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے لئے ان کے افراد کا اخلاق اور اخلاق کی بہتر قسم اور بہتر نشو ونما جماعتی طاقت اور برتری کا باعث ہوتی ہے، یہی اخلاق ''جماعت'' کی زندگی کی اصلی استعداد ہے۔ اسی استعداد سے وہ سب کچھ پاتی ہیں، اور بغیر اس استعداد کے کچھ بھی نہیں کرسکتیں۔ تزکیۂ نفوس کا عمل یہی استعداد پیدا کرتا ہے، اسی کی تولید وتکمیل، جماعتوں اور قوموں کی ''داخلی استعداد'' ہے۔

''جماعت'' کی داخلی استعداد کے لئے جس ذہنی واخلاقی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اگرچہ فرداً فرداً ہر فرد جماعت سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اس کا سارا زور ''جماعتی ذہن واخلاق'' کی طرف ہوتا ہے، یعنی وہ جماعت کے لئے ذہن واخلاق کا ایک خاص مزاج پیدا کردینا چاہتی ہے۔ چونکہ یہ مزاج پیدا نہیں ہوسکتا، جب تک جماعت کا ہر فرد اپنا انفرادی ذہن واخلاق معدوم کرکے جماعتی مزاج پیدا نہ کرلے، اس لئے وہ ذہن وعمل کا ایک خاص سانچا ڈھال لیتی ہے، یہاں تک کہ تمام افراد کی ذہنی واخلاقی خصوصیات ایک ہی انداز اور روش کی ہوجاتی ہیں، اور اپنے بے شمار انفرادی اختلافات رکھنے پر بھی ذہن واخلاق کی طبیعت میں یک قلم تماثل اور تشابہ پیدا ہوجاتا ہے ان کی خواہشیں یکساں نہیں ہوسکتیں اور یکساں نہیں ہوتیں، ان کی طبیعتوں کی عام روش ایک طرح کی نہیں ہوسکتی اور ایک طرح کی نہیں ہوتی، وہ اپنی سمجھ میں اپنی رائے میں اپنی زندگی و معیشت کے تمام معاملات میں ایک نہیں ہوجاسکتے اور ایک نہیں ہوجاتے؛ لیکن وہ ذہن وعمل کی ان ساری باتوں میں جو جماعتی زندگی کی بنیادیں اور اخلاق وسیرت کی فضیلت کا معیار ہیں، اس طرح یکساں اور ایک نگاہ وعمل ہوجاتے ہیں، کہ معلوم ہوتا ہے، سب کے اندر ایک ہی دماغ کام کررہا ہے اور سب کے اندر ایک ہی روح بول رہی ہے!

موقع نہیں کہ اطناب سے کام لیا جائے، ورنہ ضرورت تھی کہ

ان اخلاق و خصائص میں سے ایک ایک چیز کی شرح وتفصیل کی جاتی اور واضح کیا جاتا کہ قرآن وسنت نے جماعتی طبیعت کے کیا کیا بنیادی اوصاف بتلائے ہیں، اور اس کی داخلی استعداد کے ارکان ومبانی کیا کیا ہیں؟

بہرحال اشیاء وافراد کی طرح جماعات واقوام میں بھی زندگی کی اصلی سرچشمگی ان کی داخلی استعداد میں پنہاں ہوتی ہے، نہ کہ خارجی اعمال میں؛ کیوں کہ خارج کے اعمال اس سے زیادہ نہیں ہیں کہ داخلی استعداد کے لازمی نتائج وثمرات ہیں۔

پہلا دور داخلی استعداد کا دور تھا:

ظہور اسلام کا پہلا دور جو بعثت سے شروع ہوکر ہجرت پر ختم ہوا اور جس کا نقطۂ تکمیل ہجرت کا معاملہ تھا، دراصل جماعت کی داخلی استعداد کا دور تھا۔ اور اس لئے ظہور اسلام کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کا مبدء یہی دور تھا۔ نہ کہ مدنی زندگی کا دوسرا دور۔ بلاشبہ دنیا کی ظاہر بین نگاہوں میں یہ دور مصیبتوں کا دور اور بے چارگیوں اور درماندگیوں کا تسلسل تھا، لیکن بہ باطن امت مسلمہ کی ہر آنے والی فتحمندی اسی کی مصیبتوں اور کلفتوں کے اندر نشوونما پا رہی تھی۔ یہی مصیبتیں تھیں جو ''جماعت'' کے ذہن و اخلاق کے لئے تعلیم و تربیت کا مدرسہ اور تزکیہ نفوس وارواح کی امتحان گاہ تھیں۔ بدر کی فتحمندی اسی کے اندر سبق لے رہی تھی، فتح مکہ کے کامران اسی کے اندر بن اور ڈھل رہے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یرموک اور قادسیہ کی پیدایش بھی اسی کی آزمایشوں اور خودفروشیوں میں ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس جہاد کو تو صرف جہاد کہا جو مدنی زندگی میں اسلحۂ جنگ سے کرنا پڑا تھا۔ لیکن نفس واخلاق کے تزکیۂ وتربیت کا جو جہاد اس پہلے دور میں ہو رہا تھا، اسے ''جہاد کبیر'' سے تعبیر کیا۔ کیوں کہ فی الحقیقت بڑا جہاد یہی جہاد تھا: فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھادا کبیرا (۲۵:۵۳)

بالاتفاق سورۂ فرقان مکی ہے، مکی زندگی میں جس بڑے جہاد کا حکم دیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ وہ قتال کا جہاد نہ تھا۔ صبر واستقامت اور عزت وثبات کا جہاد تھا اور انہی اوصاف میں جماعت کی داخلی استعداد کی اصلی بنیادیں تھیں۔

ہجرت تکمیل کار کا اعلان تھی:

ہجرت کا واقعہ اس دور کی مصیبتوں کی انتہا تھا، اس لئے اس کی برکتوں اور سعادتوں کی بھی آخری تکمیل تھا۔ صحابہ کرام اس حقیقت سے بےخبر نہ تھے۔ اور کیوں بےخبر ہو سکتے تھے جبکہ ان کی دماغی تربیت کی اصلی روح اسی معاملہ میں مضمر تھی؟ پس جب یہ سوال سامنے آیا کہ اسلامی سنہ کی ابتدا کس واقعہ سے کی جائے؟ تو انہیں کسی ایسے واقعہ کی جستجو ہوئی جو امت کے قیام واقبال کا اصلی سرچشمہ ہو۔ آنحضرت کی پیدایش کا واقعہ یقیناً سب سے بڑا واقعہ تھا لیکن اس کے تذکار میں شخصیت سامنے آتی تھی۔ شخصیت کا عمل سامنے نہیں آتا تھا۔ بعثت کا واقعہ بھی سب سے بڑا واقعہ تھا، لیکن وہ معاملہ کی ابتدا تھی، انتہا وتکمیل نہ تھی، بدر کی جنگ اور مکہ کی فتح عظیم واقعات تھے لیکن وہ اسلام کی فتح واقبال کی بنیاد نہ تھے۔ کسی دوسری بنیاد کے نتائج وثمرات تھے۔ یہ تمام واقعات ان کے سامنے آئے، لیکن اس میں سے کسی پر بھی طبیعتیں مطمئن نہ ہوسکیں۔

بالآخر جب ہجرت کا واقعہ سامنے آ گیا، تو سب کے دلوں نے قبول کر لیا، کیوں کہ انھیں یاد آ گیا، اسلام کے ظہور وعروج کا مبدأ حقیقی اسی واقعہ میں پوشیدہ ہے، اور اس لئے یہی واقعہ ہے جسے اسلامی تاریخ کا مبدء بننا چاہیے۔

ہجرت مدینہ کی فتح تھی:

اور پھر یہ حقیقت کس درجہ واضح ہوجاتی ہے جب اس پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ ظہور اسلام کی تمام فتحمندیوں میں سب سے پہلی فتح مدینہ کی فتح تھی..... اس کی تکمیل ہجرت ہی کے واقعہ سے ہوئی، تمہیں مدینہ کے ساتھ ''فتح'' کا لفظ سنکر تعجب ہوا ہوگا کیوں تم صرف اسی فتح کے شناسا ہو جو جنگ کے میدانوں میں حاصل کی جاتی ہے،

لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ میدان جنگ کی فتح سے بڑھ کر دلوں کی آبادیوں اور روحوں کی اقلیموں کی فتح ہے، اور اسی فتح سے میدان جنگ کی فتحمندیاں بھی حاصل ہوتی ہیں، عین اس وقت جبکہ اسلام کا داعی اپنے وطن اور اہل وطن کی شقاوتوں سے مایوس ہوگیا تھا، باشندگان یثرب کی ایک جماعت پہنچتی ہے، اور رات کی تاریکی میں پوشیدہ ہوکر اپنی روح کا ایمان اور دل کی اطاعت پیش کرتی ہے، اس وقت دنیوی جاہ وجلال کا نام ونشان نہیں ہوتا، سیف وسنان کی ہیبت و جبروت کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جاسکتا، سرتاسر غربت اولی کی بے سروسامانیاں اور عہد مصائب ومحن کی درماندگیاں ہوتی ہیں۔ بایں ہمہ یثرب کی پوری آبادی اس کے سامنے جھک جاتی ہے، اور ایمان کے ایسے جوش اور عشق واطاعت کی ایسی خودفروشیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے تیار ہوجاتی ہے جو تاریخ عالم کے کسی بڑے سے بڑے فاتح اور شہنشاہ کو بھی میسر نہ آئی ہوگی۔ قیس بن صرمہ انصاری نے کیسے سچے اور دلنشیں لفظوں میں اہل مدینہ کے جوش وخروش ایمانی کی تصویر کھینچی ہے؟ وكان عبد الله ابن عباس يختلف اليه ويتحفظ منه هذه الابيات:

ثوى في قريش بضع عشرة
يذكر لو يلقى جيبا مواتيا
ويعرض في اهل المواسم نفسه
فلم يرمن يؤدى ولم يرداعيا
فلما اتانا واستقرت به النوى
واصبح مسرورا بطيبته راضيا
واصبح لا يخشى ظلامة ظالم
بعيد ولا يخشى امن الناس باغيا
بذلنا له الا موال من جل مالنا
وانفسنا عند الوغى والتاسيا
نعادى الذين عادى من الناس كلهم
جميعا، وان كان الحبيب مصافيا
ونعلم أن الله لارب غيره
وان كتاب الله اصبح هاديا!

دلوں اور روحوں کی اس فتح وتسخیر سے بڑھ کر بھی اور کوئی فتح ہوسکتی تھی؟ لیکن یہ فتح کیوں کر ہوئی؟ دور ہجرت کے آلام ومحن میں اس کا آغاز ہوا، اور ہجرت نے اس فتح کی تکمیل کردی!

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے واقعہ ہجرت کا ذکر اس طریقہ پر کیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بے سروسامانی وغربت کے اس عمل ہی میں فتح ونصرت الہی کی سب سے بڑی معنویت پوشیدہ تھی:

ثاني اثنين اذهما في الغار، اذ يقول لصاحبه: لا تحزن، ان الله معنا! فانزل الله سكينته عليه وايده بجنود لم تروها، وجعل كلمة الذين كفروا السفلى وكلمة الله هى العليا، والله عزيز حكيم (۹:۴۰) (غار کے دوساتھیوں میں سے جب ایک نے دوسرے سے کہا۔ غم ورنج نہ کرو یقیناً خدا ہمارے ساتھ ہے، اور اس کی مشیت وحکمت ہمارے لئے فتح ونصرت کی راہ باز کرنے والی ہے، پھر ایسا ہوا کہ خدا نے اپنی تسکین و طمانیت اس پر اتاردی اور فتح ونصرت کے ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی جنہیں دنیا کی ظاہر بین اور حقیقت ناآشنا آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان سرکشوں کی بات جو انکار کرتے تھے، ہمیشہ کے لئے پست ہوگئی، اور کلمۂ حق ہی کو سربلندی اور کامیابی حاصل ہوئی۔) یہ آیت سورۂ برأت کی ہے، سورۂ برات بالاتفاق اس وقت نازل ہوئی ہے جب اسلام کی ظاہری فتحمندیاں تکمیل تک پہنچ چکی تھیں، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تمام فتح مندیوں کے ظہور کے بعد بھی اس کی ضرورت باقی تھی کہ واقعۂ ہجرت کی معنوی فتحمندی یاد دلائی جائے۔ (الہلال: ۱۵-۲۹ جولائی ۱۹۷۲ء)۔

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

بچوں کا شور شرابہ:

بچے فطری طور پر شور مچانے اور آوازیں نکالتے رہنے کے عادی ہوتے ہیں، اگر اہل خانہ اس حقیقت کو سمجھ لیں تو بچوں کو خاموش کرنے میں وہ اپنی انرجی نہیں ضائع کریں گے، ہاں یہ بات مسلم ہے کہ اہل خانہ گھر میں کسی وقت پرسکون اور خاموش ماحول کے بھی خواہاں ہوتے ہیں، اس وقت ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بچہ اپنی شور شرابے کی خواہش کے ساتھ ساتھ افراد خانہ کے سکون کی ضرورت کا بھی لحاظ کرے۔

بچہ کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ خاموش رہنے کا پابند ہوجائے چاہے اس کے ساتھ اس سلسلے میں سختی ہی کیوں نہ کی جائے، صحیح بات یہ ہے کہ بچوں کو خاموش کرنے اور ان کو ایسا بنانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ وہ کوئی آواز نہ نکالیں، کوئی حرکت نہ کریں، صرف مختلف قسم کی آوازیں نکالنے سے ہی بچوں کو متعدد فوائد حاصل ہوتے ہیں، بچے کی آوازیں اس کو اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کا موقع فراہم کرتی ہیں، چنانچہ وہ اپنی جذباتی کیفیت یا اپنے غصے کا اظہار بھی اپنی آوازوں سے ہی کرتا ہے، اگر وہ نارمل حالت میں ہوتا ہے تو باتیں کرنے میں دلچسپی لیتا ہے، خواہ دوسروں سے ادھر ادھر کی باتیں کرے، یا تنہا ہی اپنے افعال پر تبصرہ کرتا رہے یا ادھر ادھر کی بکتا رہے۔

گھر والوں کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں کہ گھر میں بچوں کے وجود کا مطلب ہی طاقت، زندگی اور شور شرابہ کا وجود ہے، اب اگر گھر کے بڑوں کی طرف سے بار بار اس طرح کی آوازیں آئیں (چپ رہو، شور کم کرو، ہمیں تکلیف ہورہی ہے) تو اس سے بچوں کے لے بڑا مشکل مسئلہ پیدا ہوتا ہے، اس مصنوعی سکون اور زبردستی بچوں کو خاموش کرنے کے عمل سے یہ نقصان ہوسکتا ہے کہ بچے کی صلاحتیں اس کے اندر ہی چھپی رہ جائیں، اس کے اندر جلدی غصہ ہونے، طیش میں آنے جیسی چیز پیدا ہوجائے، اس میں ناکامی کا احساس اور سلبی فکر پیدا ہوجائے، جس کا اظہار نازیبا سلوک کی شکل میں ہونے لگے، یا جس کا اظہار وہ اپنے کھیل کود اور اپنی دوسری چیزوں کو توڑ پھوڑ کرے، یہ بات سمجھنے کی ہے کہ صحیح سلامت اور نارمل بچہ زندگی اور پھرتی سے بھرپور ہوتا ہے، وہ صبح سویرے سے لے کر رات میں سونے تک کچھ نہ کچھ حرکت Activity اس کے اندر جو زندگی، نشاط اور حرکیت ہوتی ہے اس کے استعمال کے لیے اس کو کسی نہ کسی مشغولیت activity کی ضرورت ہوتی ہی ہے، خواہ وہ نشاطات جسمانی ہوں یا پھر صرف صوتی، ایسی صورت میں گھر والے اگر کرسکیں تو یہ کرسکتے ہیں کہ بچے کے اندر موجود اس کی اس صلاحیت کو مفید کاموں میں مشغول کردیں، اگر ایسا نہیں کرسکتے تو پھر اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ بچے کو بالکل خاموش کردیں اس کو حرکت وعمل سے روک دیں، اس سے ہر حال میں گریز کرنا چاہیے کہ وہ بچے کو یہ احساس دلائیں وہ بچے کو یہ احساس دلائیں کہ وہ اپنی زندگی، نشاط اور حرکات Activity کے سبب پریشان کناور تھکا دینے والا بچہ ہے۔

اچانک تیز آواز نکالنا:

سکون حاصل کرنے کے لئے یا اپنے اندر بھرے ہوئے غیظ و غضب کو نکالنے کے لئے انسان کبھی کبھی اچانک آواز نکالتا ہے، چیخ دیتا ہے، یہ چیز بچے میں اس کی عمر کے پہلے سال میں ہی ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ جب وہ نروس ہوتا ہے تو تیز آواز نکالتا ہے، وہ ایسی آواز ہوتی ہے کہ ہم اس کو لڑنے والے یا ورزش کرنے والے کی آواز کے مشابہ قرار دے سکتے ہیں، عام طور پر لڑائی جھگڑے میں انسان اس طرح کی آوازیں محض اپنی ہمت جٹانے، مقابلے کے لئے اپنی تیاری کے اظہار اور مخالف پر اپنا رعب ڈالنے کے لیے نکالتا ہے۔ اور جس سے یہ اظہار کرتا ہے کہ وہ مقابلے کے لئے تیار ہے، اور اپنا فاع کرسکتا ہے، چنانچہ چیخنے والا جب اپنے فریقِ مخالف کے چہرے پر خوف و ہراس اور پریشانی کے آثار دیکھتا ہے تو اس کو اپنی اس مخصوص آواز کی تاثیر دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔

عام طور پر والدین بچے کی اس طرح کی آواز سے پریشان ہوتے ہیں، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ جب وہ کسی وقت بچے کو ڈانٹنا چاہتے ہیں اس کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود بھی ایسی ہی چیخ اور بلند آواز کا سہارا لیتے ہیں، یہ ملحوظ رکھنے کی بات ہے کہ عام طور پر والدین کے اس سلوک سے بچہ اپنی حرکت سے باز نہیں آتا، اس لئے ہمیں یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ بچہ اپنے آپ کو روک نہیں سکتا، جیسے کہ اس سلسلے میں ہمارے لیے خود پر قابو پانا ممکن نہیں۔

ہمیں اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ اپنے اس طرح کے عمل سے ہم اس کو مزید چیخنے کا حوصلہ نہ دیں، اور اس میں یہ احساس نہ پیدا کریں کہ گویا ہم میں اور بچوں میں پہلے خاموش ہونے کی مقابلہ آرائی ہورہی ہے۔

باتونی بچہ (زیادہ بولنے والا بچہ) Talkative Child

بچوں کی وہ چیزیں جن کے متعلق اکثر والدین شاکی ہوتے ہیں، ان ہی میں سے ایک زیادہ بولنا ہے، بسا اوقات والدین اس طرح کی شکایت کرتے رہتے ہیں کہ بچہ ہر وقت بولتا ہی رہتا ہے کہ کبھی خاموش نہیں رہتا، حتی کہ گھر والوں کو اپنے کام کاج کے لئے بالکل سکون نہیں ملتا۔

جو بچہ زیادہ بولتا ہے وہ دوسروں سے ملنا جلنا پسند کرتا ہے، اپنے آس پاس کی دنیا میں گھلنا ملنا پسند کرتا ہے، اس صورت میں اہل خانہ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ کہیں بڑا ہوکر یہ بچہ اپنی اس عادت کی وجہ سے دوسروں کی پریشانی کا سبب نہ بنے، بڑی بڑی عمر کے لوگ زیادہ باتیں اس لیے کرتے ہیں تاکہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکیں، کبھی اپنی الجھنوں اور فکروں سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھی وہ زیادہ باتیں کرتے ہیں، لیکن جو بچہ زیادہ بولتا ہے یہ وہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں کی طرح ہوجائے، بلکہ چھوٹا بچہ دوسروں سے نقاش کے لئے، باہمی گفتگو کی چاہت کے لئے زیادہ بات کرتا ہے، یا پھر اطلاعات و معلومات جمع کرنے کے لئے اور اپنے اندر موجود زندگی کے سبب زیادہ باتیں کرتا ہے۔

اگر والدین کو بچے کی اس عادت سے تکلیف ہوتی ہے تو انھیں سوچنا چاہئے کہ ان کا بچہ اپنے بولنے اور گفتگو کے ذریعہ کس قدر سیکھتا ہے، انکو یہ سمجھنا چاہئے کہ اس وقت بچہ اس مرحلہ میں ہے جبکہ وہ باہمی گفتگو کا خواہش مند ہے، اس مرحلہ میں اس سے گفتگو کرنا زیادہ مفید و سود مند ہے بہ نسبت اس کے کہ اس سے فاصلہ بنایا جائے، گفتگو نہ کی جائے، پھر وہ بھی ان بچوں کی طرح ہوجائے جو نوجوانی کے مرحلہ میں بھی اپنے والدین سے گفتگو نہیں کرپاتے۔

بچوں کے سوالات:

عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ بچے تین سے چار سال کی عمر کے دوران اپنے آس پاس کی چیزوں کی حقیقت و ماہیت کو سمجھنے کے لیئے کثرت سے سوالات کرتے ہیں، ان کے اکثر سوالات ''کیوں'' کے ارد گرد گھومتے ہیں، اور اس ''کیوں'' کا تکرار دن میں سینکڑوں بار ہوتا ہے، مثلاً روشنی روشن کیوں ہے، برف سفید کیوں ہے، لگاتار بارش کیوں ہوتی ہے، ٹماٹر سرخ کیوں ہے وغیرہ۔

کبھی وہ ''کیا''، کیسے'' کہاں سے'' اور ''کون سے'' جیسے سوالات بھی کرتے ہیں مگر ''کیوں'' کی کثرت عام طور پر اہل خانہ کو پریشان کردیتی ہے، حتی کہ بچوں سے جس کام کا مطالبہ کیا جائے اس پر وہ ''کیوں'' کا سوال قائم کردیتے ہیں، مثلاً ''میرے لیے اپنے

دانت صاف کرنا کیوں ضروری ہے، میں کھانا کیوں کھاؤں، کپڑے کیوں بدلوں۔

بچوں کے سوالات کا سامنا کرنے کے لیے بہترین اصول یہ ہے کہ اہل خانہ کے پیش نظر ہمیشہ یہ رہے کہ یہ سوالات سیکھنے کا ایک جزء ہیں، اور ظاہر ہے کہ بچے کی زندگی میں سیکھنے کا عمل بہت طویل ہوتا ہے، اس لیے اہل خانہ کو چاہیے کہ حتی الامکان ان سوالات کا معقول جواب دیں اور جن معلومات کی ان کو ضرورت ہو انھیں فراہم کریں، اس طرح کے جواب سے اجتناب کرنا چاہیے کہ ''تم یہ کام کرو بس اس لیے کہ میں نے کہا ہے'' اور یہ معاملہ ایسا ہی ہے جیسا ہے''، بسا اوقات والدین یوں کہتے ہیں کہ ''تم اس قدر سوال کرتے ہو کہ طبیعت اکتا جاتی ہے''، اس طرح کی باتوں سے بچوں کی ہمت شکنی کرنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ بچہ اپنی دنیا سے واقف ہونے کا حریص ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ دنیا بہت وسیع ہے، اس کے لیے نئی نئی چیزوں سے بھری ہوئی ہے، وہ ہر چیز سے واقف ہونا چاہتا ہے اس لیے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے وہ بہت کم ہے جبکہ اس کو زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

والدین کو چاہیے کہ واضح اور آسان انداز میں بے جا تفصیل اور پیچیدگی سے بچتے ہوئے جوابات دیں، ایسا نہ کریں کہ محض اس سوال کے جواب میں کہ ''ستارے رات میں کیوں نکلتے ہیں'' اور ''موسم خریف میں گھاس کیوں ختم ہوجاتی ہے''، وہ فزکس و کیمیا کی تفصیلات بیان کرنا شروع کردیں۔

بسا اوقات والدین یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا بچوں سے کسی کام کا مطالبہ کرنا کافی ہے یا پھر یہ ضروری ہے کہ وہ ہر اس کام کی ان کے سامنے تشریح (Explain) کریں جس کا ان کو پابند کرنا چاہتے ہیں، بالخصوص ان کے ذہن میں یہ سوال تب پیدا ہوتا ہے جبکہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ بچہ محض کام سے بھاگنے کے لیے سوالات کررہا ہے۔

نظریاتی اعتبار سے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ماں باپ کا مطالبہ کرنا ہی کافی ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ بچہ ایک فرمانبردار انسان کی طرح اس کام کے اسباب سے واقف ہوکر کام انجام دے، اس طرح زیادہ امکان ہے کہ وہ آئندہ ایک معاون انسان بن سکے، کیوں کہ وہ اگر ان اسباب سے کلی اتفاق نہ بھی کر پائے گا جو والدین نے ذکر کیا تو بھی وہ والدین کی نرمی، ان کے صبر اور اسباب ومحرکات کی تشریح میں ان کی محبت کی قدر کریں گا اس کے برخلاف والدین اگر اس پر اکتفا کرلیں گے کہ ''بس تم یہ کرو اس لیے کہ ہم نے کہا ہے'' تو بچے کی نظر میں والدین کی صورت ایسی بنے گی کہ گویا وہ اپنی رائے پر ہی اڑتے ہیں، ان کو محض قوانین کے وضع و نافذ کرنے سے مطلب ہے، خواہ بچہ سمجھے یا نہ سمجھے اس کی انھیں کوئی پرواہ نہیں، ہم اس میں فرق کرتے ہیں کہ بچے کے سامنے کام کے جواز کی تشریح کر دی جائے پھر وہ کام کو انجام دے خواہ ہمارے پیش کردہ جواز سے اتفاق کرے یا نہ کرے، اور اس میں کہ وہ جب تک راضی نہ ہو تب تک کام ہی نہ انجام دے، یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے کہ جس کام میں بچوں کو دلچسپی نہیں ہوتی بچے اس سے فرار پانے کے لئے ہزار بہانے تلاشتے ہیں، اب یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کے لیے مطلوب عمل کی تحدید کریں اور ان کو پابند کرنے کے لیے اسباب ووجوہات بیان کرنے کے ذریعہ اس کام کی اہمیت ان پر واضح کریں۔

بچوں کی نظر میں والدین کی سب سے زیادہ قدر اس سے بڑھتی ہے کہ والدین انصاف پسند اور حقیقت پسند ہوں وہ ان سے بات کریں اور ان کے سوالات کی وضاحت کریں، ان کے سولات پر ہمیشہ صبر کا مظاہرہ کریں، بچوں کے نقطۂ نظر کو دیکھنے کی کوشش کریں، اگر بچے معقول اسباب کا ذکر کریں تو انھیں تسلیم کرنا چاہیے، یہ واضح رہنا چاہیے کہ اگر بچے والدین کو منصف دیکھیں گے تو والدین کے ساتھ ان کے لیے محبت آمیز تعلق قائم کرنا آسان ہوگا، پھر وہ ایسا تعلق ہوگا جو بچپن اور عنفوان شباب سے لے کر بڑے ہونے تک تمام مشکلات میں سہارا بنے گا۔

☆☆☆

❑ فکر اسلامی

(قسط-۱۹)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فرض شناسی:

۱۹۶۷ء میں عربوں کی اسرائیل سے شکست کے بعد مولاناؒ نے جو مضامین لکھے اور عرب قومیت کی تحریک کو جس طرح ھدف تنقید بنا کر اس کے خطرات اور کمزوریوں کی نشاندہی کی وہ وقت کا تقاضہ اور دینی غیرت کا فریضہ تھا، لیکن بعض لوگ اس پر چراغ پا ہوئے، انھیں مولانا کی یہ تنقید مادی یا سیاسی مفاد کے باعث شاید اچھی نہ لگی جیسے آج بعض عرب ممالک پر تنقید سے لوگ بلبلا اٹھے اور حق و باطل کی کشمکش میں حق کا ساتھ دینے پر اس کو شخصی جنگ کا رنگ دے کر حق کا ساتھ دینے والوں کے خلاف ہو گئے، حضرت مولانا نے بہت صاف الفاظ میں لکھا ہے:۔

''لیکن قرآن مجید کے ایک حقیر طالب علم، واقعات و حوادث سے سبق لینے والے ایک مسلمان اور عربوں اور مسلمانوں کی قسمت سے اپنی قسمت وابستہ سمجھنے والے ایک انسان کی حیثیت سے اس نے اپنا فرض سمجھا کہ وہ اپنی ملت کو اپنے کمزور پہلوؤں کو بھی دیکھنے، اپنی بیماریوں کو سمجھنے اور اپنے قائدین کا احتساب کرنے کی دعوت دے کہ قومیں اور ملتیں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں''

یہ فرض خواہ کتنا ہی دشوار و ناخوشگوار ہو، خواہ وہ کتنی ہی تنقید اور ملامت اور دوستوں کے غم و غصہ کو دعوت دے بہر حال ایک داعیٔ حق کے لئے ایک دینی فریضہ، ایک آشنائے حق کے لئے ادائے شہادت اور ایک دردمند معالج کے لئے ضروری عمل جراحی کے مرادف ہے اور۔ ؎ عاشقاں بندۂ حال اند و چناں نیز کنند۔ (عالم عربی کا المیہ ص ۲۳)

جمہوریت پر گہری نظر

مولاناؒ اس وطن عزیز کے مسلمانوں کو بارہا اپنے حقوق کو جاننے اور ان کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کے لئے ابھارتے رہے، ایک موقع پر فرمایا:۔

''جمہوری ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے شہری اور جمہوری حقوق کو فخر و اعتماد اور جرأت و ذہانت کے ساتھ استعمال کریں، کیونکہ وہ بھی ملک کے وفادار اور دیانت دار فرزند ہیں ان کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو غالب اکثریت کو حاصل ہیں، اس طرح ان کو اس بات کے مواقع حاصل رہیں گے کہ وہ اپنے حقوق اور اپنے مقام و منصب کی حفاظت کریں اپنے دین و مذہب کے مطابق زندگی گذاریں، اپنی شریعت اور دینی تعلیم کو غیروں کی مداخلت سے محفوظ رکھیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ مجالس قانون ساز میں بننے والے قوانین کا ذہانت اور بیدار مغزی کیساتھ مسلسل مطالعہ کرتے رہیں اوران مجالس کے نمائندوں کے انتخاب میں بھی اپنا پورا وزن استعمال کریں۔

ایسا نہ ہو کہ غفلت میں کسی مصیبت یا مشکل میں پھنس جائیں،اوراپنے مذہب وعقیدہ کے خلاف قوانین پرعمل کرنے اورحالات سے صلح کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ان کواہل مصر کے لئے فاتح مصرسیدنا عمروبن عاصؓ کی وصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے۔أنتم فی رباط دائم لتشوف القلوب الیکم ''تم مستقل محاز پر ہو۔کیونکہ مخالفین کے دل تمہارے ہی طرف لگے ہوئے ہیں'' (خطبات علی میاں ج ۳۔ص ۶۴)

اسلام کو اقتدار کی ضرورت

مذہب اسلام کی پوری تاریخ دعوت وعزیمت سے وابستہ ہے،لیکن اس نکتہ کوفراموش نہیں کیا جاسکتا کہ بغیر اقتدار کے کام چلتا رہے گا،اس امت کو جوفریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر دیا گیا ہے اس میں استعلاء وغلبہ کی ضرورت ہے،اسلئے کہ صیغۂ اُمرونہی کا استعمال ہی استعلاء کی بنیاد پر ہوتا ہے:۔

''اگر چہ میرا تعلق فطری طور پر خاندانی طور پر اس مکتب فکر اوراس گروہ سے ہے جو خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات پر وسعت وافلاک میں تکبیر مسلسل کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہے،میری مراد سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اوران کے اولوالعزم، عالی ہمت رفقاء سے ہے جنہوں نے احیائے خلافت اسلامیہ کی کوشش کی اوران پچھلی صدیوں میں پورے عالم اسلام میں کسی ایسی جامع مکمل ،بلند نظر، بلند ہمت جماعت کا سراغ نہیں لگتا جیسا کہ حضرت سید صاحبؒ کی جماعت تھی ،میرا تعلق اس جماعت سے ہے،اور میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے مسلمانوں کو حریت کی فضاء کی ضرورت ہے اور خدا کا یہ فرمان جس طرح نزول کے وقت صحیح تھا،آج بھی صحیح ہے اور قیامت تک صحیح ہوگا۔

الذین ان مکنّٰھم فی لأرض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا با لمعروف ونھوا عن المنکر (الحج ۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اورزکوٰۃ ادا کریں اورنیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں۔

آپ خیال کیجئے کہ معروف ومنکر کے لئے قرآن مجید میں اور حدیث میں امرونہی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ،استدعا و درخواست کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔عربی زبان ایسی تنگ دامن نہیں ہے کہ اس کے اندر صرف امرونہی کے الفاظ ہوں اور دوسرے الفاظ نہ ہوں،جن میں تواضع ہے،خوشامد ہے،جن میں استدعا ہے،جن میں مطالبہ ہے، بلکہ اس کے لئے جہاں کہیں بھی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ امراورنہی کے ہیں۔تأ مرون بالمعروف و تنھون عن المنکر ،کنتم خیر أمۃ أخرجت للناس تأ مرون بالمعروف و تنھون عن المنکر اورامرونہی طاقت چاہتے ہیں۔امرونہی وہ مقام چاہتے ہیں جہاں سے ہم اعتماد کے ساتھ اور جرأت کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔امر میں اور نہی میں ایک استعلاء ہے ۔امرونہی درخواست کے معنی میں نہیں،امرونہی حکم دینا اورروکنا،اس کے

لئے آدمی کے اندر قوت چاہئے، ایسا مقام اور ایسی بلندی چاہئے، ایسا اعتماد چاہئے اور اس کی ایسی وقعت ہو دلوں میں کہ وہ امر کر سکے نہی کر سکے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو قوت کی ضرورت ہے، اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے کہ ہمیشہ وہ یہی نہ کہے کہ ''اگر ایسا کر لیا جاتا تو اچھا تھا'' ہماری درخواست ہے اور ہم آپ کو ترغیب دیتے ہیں ''ہم تبلیغ کرتے ہیں''۔ اپنی جگہ پر یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن قرآن جو معیار و میزان ہے اس میں الفاظ امر و نہی کے ہیں، جن میں مسلمانوں کو وہ طاقت حاصل کرنی چاہئے کہ جس مقام پر فائز ہو کر وہ حکم دے سکیں اور روک سکیں، اس لئے کہ فطرت انسانی تعریف تو کر دیتی ہے اور وہ خوش بھی ہو جاتی ہے، لیکن انسانی نسل کی پوری اصلاح مکمل اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتی جس کے نتیجے میں أقـــــامـــوا الصلوٰۃ و اٰتو ا الز کوٰۃ اور أمر با لمعروف اور نهی عــن الــمــنـكـر کے الفاظ آئے ہیں''۔ (خطبات علی میاں ج ۔۴، ص ۲۸۲۔۲۸۳)

اصلاح معاشرہ بنیاد ھے

اگر معاشرہ میں صحیح و غلط اور طیب و خبیث کی تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو معاشرہ بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے، پھر اس کے ہر فرد کو خیر کو قبول کرنے میں دیر نہیں لگتی، چنانچہ اسی اصلاح کی بنیاد پر جب معاشرہ کا ہر طبقہ اور ہر فرد تعاون کرے گا تو شریعت کے نفاذ میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی:۔

''اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلامی قانون سازی کی جو بات کی جا رہی ہے، اسلامی شریعت کے نفاذ کے جو ارادے ہیں، ان میں سستی پیدا کی جائے، میں ہر گز اس غلط فہمی کی اجازت نہیں دوں گا، ایک لمحہ کے لئے بھی اس کوشش کو روکنے کے حق میں نہیں، یہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ کامیابی کا انحصار اسی معاشرہ پر ہے، اگر معاشرہ اس کا استقبال کرتا ہے اور ہم نے، ہمارے دین کے داعیوں نے، مصنفین نے، صحافت نے، ہمارے ٹیلی ویژن نے، ریڈیو نے، میں یہاں تک عرض کرتا ہوں کہ ابلاغ کے جتنے ذرائع ہیں اگر ان سب نے یہ کوشش کی، یہ مہم چلائی کہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے پیمانے بدلیں، اندر کے احساسات بدلیں اور نیکی، خدا ترسی، سنجیدگی، متانت، صبر و تحمل، نفس کی ترغیبات، مالی ترغیبات، یا اخلاقی امتحانات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو پھر اس معاشرہ پر بڑے سے بڑا بوجھ ڈالا جا سکتا ہے اور وہ خلافت اسلامی کا بھی بوجھ برداشت کر سکتا ہے اور مجھے اس میں بالکل شبہ نہیں کہ اگر معاشرہ کی اصلاح ہو جائے اور یہ ساری طاقتیں جو اثر انداز ہوتی ہیں اس میں آپس میں تعاون ہو اور یہ سب اشتراک عمل کے ساتھ معاشرے کی اصلاح میں کچھ عرصہ لگ جائیں تو خلافت اسلامیہ کا خواب بھی حقیقت بن سکتا ہے، اس وقت صورت یہ ہے کہ اس گروہ کا جادو چل رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں ابلاغ کے ذرائع ہیں'' (خطبات علی میاں، ج ۴ ص ۲۸۶-۲۸۷)۔

(......**جاری**)

☆☆☆

❑ انکار حدیث

فتنۂ وضع حدیث کے اسباب

محمد فرید حبیب ندوی

صحابہ کرام کے آخری دور میں بہت سے فتنوں نے جنم لیا، انھی میں ایک نہایت خطرناک فتنہ وضع حدیث کا تھا، اس کے اسباب میں خلافت راشدہ کے آخری دور میں رونما ہونے والے سیاسی اختلافات بنیادی سبب کی حیثیت رکھتے ہیں،، عراق میں- جو شیعہ کا مرکز تھا- یہ فتنہ پروان چڑھا، اور شیعہ نے ہی اس سنگین جرم کی داغ بیل ڈالی تھی، عراق کے بارے میں امام زہریؒ کا قول ہے: ''حدیث ہمارے یہاں سے بالشت بھر جاتی ہے، اور جب عراق پہنچ کر وہاں سے واپس آتی ہے، تو گز کے بقدر ہو جاتی ہے''، امام مالک نے عراق کو ''ٹکسال'' (حدیثیں گڑھنے کا مرکز) قرار دیا ہے، بہرحال فتنۂ وضع حدیث کا اولین سبب سیاسی اختلافات تھے، پھر بعد میں اور بھی بہت سے اسباب پیدا ہوئے، ذیل میں ان کی کچھ تفصیل درج ہے:

۱۔ سیاسی اختلافات:

سیاسی اختلافات کے نتیجے میں بہت سے فرقے پیدا ہوئے، اور ان میں سے بہت سے فرقے اللہ کے رسول ﷺ پر جھوٹ بولنے کے جرم میں شریک رہے، ان میں سب سے بڑا کردار شیعہ کا ہے، امام مالک رحمہ اللہ سے روافض کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: ''ان سے بات کرو اور نہ ان کی روایات قبول کرو، وہ جھوٹ بولتے ہیں''۔ قاضی شریک بن عبداللہ- جو معتدل شیعہ تھے- فرماتے ہیں: ''میں جس سے بھی ملتا ہوں روایت کر لیتا ہوں، لیکن شیعہ سے نہیں کرتا، اس لئے کہ وہ حدیثیں گڑھ کر انہیں دین بناڈالتے ہیں''۔

حماد بن مسلم کہتے ہیں: ''مجھے شیعہ کے ایک شیخ نے بتایا: جب ہم کسی چیز کو اچھا سمجھتے، تو اس کے مطابق حدیث گڑھ لیتے''۔

امام شافعی کا ارشاد ہے: ''میں نے شیعہ سے زیادہ جھوٹی کوئی جماعت نہیں دیکھی''۔

روافض نے جو حدیثیں وضع کیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ غدیر خم والی حدیث، جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی ﷺ نے صحابہ کے ایک مجمع کے سامنے حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کیا۔

۲۔ من أراد أن ينظر الى آدم فى علمه والى نوح فى تقواه ..... فلينظر الى علي"۔

۳۔ میں علم کی ترازو ہوں، علی اس کے پلڑے ہیں، اور حسن وحسین اس کی رسیاں ہیں۔

۴۔ علی کی محبت ایسی نیکی ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی گناہ سے نقصان نہ ہوگا.....الخ۔

۵۔ اسی طرح حضرت فاطمہؓ کی فضیلت میں یہ حدیث گڑھی، جس میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ معراج میں تشریف لے گئے، تو حضرت جبرئیل نے آپ کو جنت کا پھل (سفرجل) پیش کیا، آپ نے اسے تناول فرمایا پھر آپ نے حضرت خدیجہ سے ملاقات کی، تو حضرت فاطمہ پیدا ہوئیں، پھر بعد میں جب آپ کا دل چاہتا کہ جنت کی خوشبو سونگھیں تو آپ

حضرت فاطمہ کو سونگھ لیتے''۔

اس حدیث کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں، اس لئے کہ حضرت فاطمہؓ کی ولادت واقعۂ اسراء سے پہلے ہوگئی تھی۔ اسی طرح حضرت خدیجہؓ کی وفات فرضیت نماز سے قبل ہوچکی تھی۔

شیعہ نے جس طرح اہل بیت کی فضیلت میں احادیث وضع کیں، اسی طرح صحابہ کرام، بالخصوص حضرات شیخین کی مذمت میں بھی کیں۔

معتزلی شیعہ عالم ابن ابی الحدید اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہ کو کوڑے مارے اور حضرت علی کی گردن میں اس کا پھندا ڈالا، کہتے ہیں: ''محدثین کے نزدیک ان جیسی حدیثوں کو کوئی اصل نہیں، یہ شیعوں کی ایجاد کردہ ہیں''۔

اسی طرح حضرت معاویہؓ کی مذمت میں یہ حدیث گھڑی: ''إذا رأیتم معاویة علی قبری فاقتلوه''۔

اور حضرت معاویہ وعمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی مذمت میں یہ حدیث گھڑی: ''اللهم أرکسهما فی الفتنة ودعها فی النار دعاً''۔

اسی طرح روافض نے اپنی خواہشات پوری کرنے کے لئے بہت سی حدیثیں گڑھیں، جن کی تعداد بڑی حیران کن ہے، خلیلی نے ''الارشاد'' میں کہا ہے کہ ''روافض نے حضرت علی اور اہل بیت کی فضیلت میں تین لاکھ حدیثیں وضع کیں''۔

اگرچہ یہ قول مبالغہ پر مبنی ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے بہت بڑی تعداد میں حدیثیں وضع کیں۔ ایک مسلمان انہیں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے، لیکن اگر روافض کی اصلیت سے واقفیت ہو تو حیرانی کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی، اس لئے کہ ان کی اکثریت ایرانی الاصل ہے، جنہوں نے شیعیت کا لبادہ اوڑھا ہی اس لئے تھا کہ اسلام کو نقصان پہنچائیں، یا وہ بظاہر اسلام کے دائرہ میں آگئے تھے، مگر اپنی بت پرستانہ ذہنیت سے باہر نہ آسکے تھے اور ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

افسوس تو یہ ہے کہ جاہل اہل سنت نے بھی ان کے مقابلہ میں یہ غلط کام کیا، گو ان کی وضع کردہ احادیث کا دائرہ بہت محدود ہے، جہلاء اہل سنت کی گھڑی ہوئی کچھ حدیثیں یہ ہیں:

حضرت معاویہ اور امویوں کے طرفداروں نے یہ حدیثیں وضع کیں:

۱۔ ''امانت دار تین ہیں، میں، جبرئیل اور معاویہ''۔

۲۔ ''اے معاویہ! تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں''۔

۳۔ ''جنت میں ایک موقع پر معاویہ مجھے نظر نہ آئیں گے اور بڑی دیر سے آئیں گے، تو میں پوچھوں گا: معاویہ کہاں سے آئے ہو؟ وہ کہیں گے: میں اللہ تعالیٰ سے سرگوشی میں مشغول تھا، آپ ﷺ فرمائیں گے: دنیا میں جو تمہاری توہین کی گئی تھی، یہ اس کا صلہ ہے''۔

اسی طرح عباسیوں کے حامیوں نے بھی یہ کام کیا، چنانچہ انہوں نے وصیت علی کی من گھڑت حدیث کے مقابلہ میں یہ حدیث وضع کردی:

''عباس میرے وصی اور وارث ہیں.....''۔

ان کے جھوٹ کا اندازہ اس حدیث سے لگائیے:

آپ ﷺ نے حضرت عباس سے فرمایا: ''جب ۱۳۵ھ ہوگی تو یہ سال تمہارے اور تمہاری اولاد سفاح ومنصور کے لئے ہوگا''۔

کیا خوارج حدیث میں جھوٹ بولتے تھے؟؟

علماء نے بیان کیا ہے کہ اسلامی فرقوں میں سب سے کم جھوٹ بولنے والے خوارج تھے، اور ان کے کم جھوٹ بولنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو اور بقول کعبی مطلق گناہ کا ارتکاب کرنے والے کو کافر سمجھتے تھے، اس لئے جھوٹ بولنا ان کے یہاں کسی بھی

حالت میں جائز نہ تھا، لیکن پھر بھی ان کے بعض اکابر رسول اللہ ﷺ پر دروغ گوئی سے محفوظ نہ رہ سکے، چنانچہ ان کے ایک شیخ کا قول ہے: ''یہ حدیثیں دین ہیں، لہذا تم خوب غور کرلو کہ کس سے دین اخذ کر رہے ہو، اس لئے کہ جب ہم کوئی بات چاہتے تھے تو اسے حدیث بنا دیتے تھے''۔

اور عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں: مشہور حدیث ''جب تمہارے پاس میری کوئی حدیث پہنچے تو اسے کتاب اللہ پر پیش کرو، اگر وہ کتاب اللہ سے موافق ہو، تو سمجھ لو کہ وہ میرا ہی قول ہے.....'' خوارج اور زنادقہ کی وضع کردہ ہے۔

قدیم و جدید مصنفین کا بھی نقطۂ نظر یہی ہے کہ خوارج نے بھی حدیثیں وضع کی ہیں، گو کہ وہ بہت کم ہیں، لیکن میں بحث و تحقیق کے باوجود کوئی ایسی حدیث نہ پا سکا جسے کسی خارجی نے وضع کیا ہو، اوپر خوارج کے ایک شیخ کا جو قول ذکر کیا گیا ہے، تو مجھے نہیں معلوم کہ یہ کون شیخ ہیں، اور اس جیسی بات حماد بن سلم نے ایک رافضی شیخ سے بھی نقل کی ہے جیسا کہ گذرا، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اس میں غلطی ہوگئی ہو اور رافضی کی جگہ خارجی کہہ دیا گیا ہو، جبکہ ہمیں ان کی وضع کردہ کوئی حدیث ملتی بھی نہیں ہے۔

جہاں تک ابن مہدی کے قول کی بات ہے، تو مجھے نہیں معلوم کہ اس کی نسبت ابن مہدی کی طرف صحیح بھی ہے یا نہیں؟ اگر صحیح بھی ہے تو اس میں اس کا ذکر نہیں کہ واضع کون ہے؟ اور یہ کب وضع کی گئی؟

اس قول کے صحیح ہونے میں ہمیں جو شک ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس میں وضع کی نسبت زنادقہ کی طرف بھی کی گئی ہے، تو سوال یہ ہے کہ خوارج اور زنادقہ دونوں اس کو وضع کرنے پر کیسے متفق ہوگئے؟ پھر دونوں نے ایک ساتھ وضع کی؟ یا پہلے خوارج نے؟ یا پہلے زنادقہ نے؟۔

اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ابن مہدی کے علاوہ دیگر حضرات سے اس کی نسبت صرف زنادقہ کی طرف نقل کی گئی ہے، چنانچہ یحی بن معین اور خطابی نے اس حدیث کے وضع کی نسبت صرف زنادقہ کی طرف کی ہے، اس میں خوارج کا کوئی ذکر تک نہیں، جیسا کہ شمس الحق عظیم آبادی نے بیان کیا ہے۔

بڑی کوشش کے باوجود بھی مجھے کوئی ایسی دلیل نہ مل سکی، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ خوارج بھی حدیثیں وضع کرتے تھے، جب وہ عام حالات میں جھوٹ نہیں بولتے تھے تو حدیث میں کیسے بول سکتے تھے؟ نیز اگر وہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھنے والے ہوتے تو امراء و خلفاء پر جھوٹ بولنے کو بدرجہ اولی جائز سمجھتے، لیکن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بڑے جری اور بے باک تھے اور امراء و خلفاء کی کھلے عام تنقید کرتے تھے۔

میرا مقصد ان کی براءت کا اظہار نہیں ہے، بلکہ میرا مدعا صرف اس قدر ہے کہ جب تک ان کے وضع کی کوئی دلیل نہ مل جائے، ہم ان کی طرف وضع کی نسبت نہیں کر سکتے۔ اس کے برخلاف ائمہ سے ان کی تصدیق و توثیق منقول ہے، ابوداؤد فرماتے ہیں: ''اہل ہوی میں خوارج سے زیادہ صحیح الحدیث کوئی نہیں''۔

ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

''اہل ہوی میں خوارج سے زیادہ سچا اور عادل کوئی نہیں''۔

ابن تیمیہ ہی فرماتے ہیں: ''خوارج کی حدیثیں سب سے زیادہ صحیح احادیث میں سے ہوتی ہیں''۔

۲۔ زندقہ:

زندقہ کا مطلب ہے اسلام کو بطور دین و حکومت کے ناپسند کرنا، اس فکر کی وجہ سے بھی بہت سوں نے احادیث وضع کیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اسلام نے دنیا کی بہت سی حکومتوں اور قیادتوں کو شکست دے کر اپنے دائرہ کو وسیع کرنا شروع کیا، تو بہت سی قیادتیں اور حکومتیں اسلام سے خار کھانے لگیں اور انہوں نے محسوس کیا

کہ اسلام کے بڑھتے قدم روک کر اپنی سابقہ قوت وطاقت کی بازیابی ان کے لئے ممکن نہیں ہے، اسلام کی تو سیاسی وعسکری قوت روز افزوں ہے، تو انہوں نے اسلام کے عقائد میں رخنہ ڈالنے اور اس کے محاسن کو غلط انداز میں پیش کرنے اور اس کے پیروکاروں کے درمیان انتشار وافتراق برپا کرنے کے ذریعے انتقام لینا شروع کیا، چنانچہ کبھی وہ تشیع کا لبادہ اوڑھ کر آئے، کبھی زہد وتصوف کا بھیس بدل کر اور کبھی حکمت وفلسفہ کے نام پر، ان تمام ہتھیاروں سے وہ اسلام کے قصر شامخ میں رخنہ ڈالنا چاہتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے دوام وخلود کا فیصلہ کر دیا تھا، چنانچہ ان کی کوششیں ناکام ہوئیں اور انہیں حسرت وافسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

زنادقہ نے جو حدیثیں وضع کیں، ان کے کچھ نمونے ملاحظے فرمائیے:

۱۔ ''ہمارا رب عرفہ کی رات ایک خاکستری رنگ کے اونٹ پر نزول فرماتا ہے اور سواروں سے مصافحہ اور پیدل چلنے والوں سے معانقہ کرتا ہے''۔

۲۔ ''اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنے سینے اور بازوؤں کے بالوں سے پیدا کیا''۔

۳۔ ''اللہ تعالیٰ کی آنکھیں دکھ آئیں تو فرشتوں نے اس کی عیادت کی''۔

۴۔ ''بیگن ہر مرض کی دوا ہے''۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح ان زنادقہ نے عقائد واخلاق، طب اور حلال وحرام کے بارے میں ہزاروں احادیث وضع کیں، ایک زندیق نے خود خلیفہ مہدی کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ اس نے سو حدیثیں وضع کی ہیں جو لوگوں میں عام ہو چکی ہیں۔ جب عبدالکریم بن ابی عوجاء کو قتل کے لئے لایا گیا تو اس نے اقرار کیا کہ میں نے چار ہزار احادیث گھڑی تھیں، جن میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیا گیا تھا۔

عباسی خلفاء نے جب ان زنادقہ کی طرف سے سیاسی خطرہ محسوس کیا تو انہیں گرفتار، قتل اور جلا وطن کر دیا، اس سلسلے میں سب سے سرگرم حصہ خلیفہ مہدی کا رہا، جس نے زنادقہ کی کمین گاہوں پر چھاپے مار کر انہیں گرفتار کرایا۔ اس دور کے مشہور وضاعین میں سے چند نام یہ ہیں:

۱۔ عبدالکریم بن ابی عوجاء، جسے امیر بصرہ محمد بن سلیمان نے قتل کرایا۔

۲۔ بیان بن سمعان مہدی، جسے خالد بن عبداللہ قسری نے قتل کیا۔

۳۔ محمد بن سعید مصلوب، اسے ابوجعفر منصور نے قتل کیا۔

۳۔ مختلف قسم کے تعصبات: جیسے جنسی، قبائلی اور زبان ووطن اور کسی امام کے لئے تعصب:

چنانچہ شعوبیوں (عربوں کے مخالف ایک فرقہ) نے یہ حدیث وضع کی: ''جب اللہ تعالیٰ غصہ ہوتا ہے تو عربی میں وحی نازل کرتا ہے اور جب خوش ہوتا ہے تو فارسی میں نازل کرتا ہے''۔ ان کے رد میں بعض جاہل عربوں نے یہ حدیث وضع کی: ''جب اللہ تعالیٰ غصہ ہوتا ہے تو فارسی میں وحی نازل کرتا ہے، اور جب خوش ہوتا ہے تو عربی میں نازل کرتا ہے''۔

متعصب حنفیوں نے یہ حدیث وضع کی: ''میری امت میں ابوحنیفہ نعمان کے نام سے ایک شخص ہوگا، جو میری امت کا چراغ ہوگا''

٤۔ قصے اور وعظ گوئی:

قصہ گو حضرات عوام سے واہ واہی وصول کرنے کے لئے جھوٹے قصے رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے بیان کرتے تھے، وہ لوگوں کو متاثر کرنے اور اپنی خطیبانہ شان کا اظہار کرنے کے لئے جعلی احادیث بیان کرتے، مثلاً: ''اللہ تعالیٰ اپنے ولی کو جنت میں سفید موتیوں سے بنے ایک محل میں ٹھکانہ عطا کرے گا، جس میں ستر

ہزار کمرے ہوں گے، ہر کمرے میں ستر ہزار گنبد ہوں گے'' اور جیسے ''جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا تو اللہ تعالیٰ اس لفظ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے، جس کی چونچ سونے کی اور پیر مرجان کے ہوتے ہیں۔''

اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک واعظ نے امام احمد اور یحیی کے حوالے سے ایک طویل حدیث بیان کی، اتفاق سے یہ دونوں اس مجلس میں موجود تھے، اور انھوں نے وہ حدیث روایت نہیں کی تھی، مجلس سے فارغ ہونے کے بعد ان دونوں نے اسے بلا کر دریافت کیا اور کہا'' ہم نے تو یہ حدیث کبھی نہیں سنی، پھر تم ہمارے واسطے سے یہ حدیث کیسے روایت کرتے ہو''، وہ کہنے لگا: ''تم کیا سمجھتے ہو کہ صرف دو ہی احمد اور یحیی ہیں، میں نے سترہ ایسے لوگوں سے روایت کی ہے جن کا نام احمد بن حنبل اور یحیی بن معین تھا''۔

اور افسوس کی بات یہ کہ ان واعظوں کا عوام پر بڑا گہرا اثر تھا، وہ ان کی باتوں کو بڑی توجہ سے سنتے تھے اور اگر کوئی ان کی حقیقت سے پردہ اٹھاتا تو اس کے ہی خلاف ہو جاتے، چنانچہ ایک مرتبہ ابن جریر طبری نے ایک واعظ کو اس بات پر ٹوکا کہ اس نے ''عسی أن یبعثك ربك مقاما محموداً''، کی غلط تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ محمد ﷺ عرش بریں پر اللہ تعالیٰ کے ہم نشیں ہوں گے، ان کے اس نکیر کرنے پر عوام نے ان کے مکان پر سنگ باری شروع کر دی، حتی کہ ان کے گھر کا دروازہ پتھروں سے پٹ گیا۔

۵۔ فقہی اور کلامی اختلافات:

فقہی اور کلامی مکاتب فکر کے بہت سے جاہل پیروکاروں نے اپنے مسلک کی تائید میں بہت سی جھوٹی حدیثیں وضع کیں، مثال کے طور پر یہ حدیثیں:

۱۔ ''جس نے نماز میں رفع یدین کیا، اس کی نماز نہیں ہوگی''۔

۲۔ ''جنبی کے لئے تین مرتبہ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے''۔

۳۔ ''جبرئیل نے کعبہ کے پاس مجھے نماز پڑھائی تو تسمیہ زور سے پڑھی''۔

۴۔ ''جس نے کہا کہ قرآن مخلوق ہے تو اس نے کفر کیا''۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں، جنہیں اپنے مسلک کے اثبات کے لئے وضع کیا گیا۔

۶۔ ترغیب و ترھیب کے لئے:

بہت سے عابد و زاہد لوگوں نے ترغیب و ترہیب کے مقصد سے احادیث وضع کیں، اس میں گرچہ ان کی نیت نیک تھی کہ اس طرح لوگوں میں اچھے اعمال کا شوق اور برے اعمال سے ڈر پیدا ہوگا، لیکن ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا، وہ سراسر جہالت پر مبنی تھا، اور جب انہیں ٹوکا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اوپر جھوٹ بولنے والے کو جہنم کی وعید سنائی ہے تو انہوں نے یہ تاویل کی کہ ہم آپ پر جھوٹ نہیں بولتے، بلکہ آپ کے لئے بولتے ہیں۔ اس قسم کی خاص کر وہ احادیث ہیں جو الگ الگ سورتوں کے فضائل میں ہیں، نوح بن ابی مریم نے وضع حدیث کا اعتراف کیا تھا اور عذر یہ پیش کیا تھا کہ جب میں نے لوگوں کو فقہ ابو حنیفہ اور مغازی ابن اسحاق میں مشغول دیکھا، تو میں نے ان کے اندر قرآن کا شوق پیدا کرنے کے لئے اس کے فضائل کی حدیثیں وضع کیں۔ اس طرح کے زاہدوں میں ایک نمایاں نام غلام خلیل کا ہے، اس کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ جس دن اس کا انتقال ہوا ہے تو سوگ کی وجہ سے بغداد کا بازار بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے رقائق کے موضوع پر بہت سی احادیث وضع کی تھیں، جب اس سے اس سلسلے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ ہم نے عوام کے دلوں میں رقت پیدا کرنے کے لئے یہ حدیثیں وضع کی تھیں۔

۷۔ سلاطین و امراء کی خوشنودی:

خلیفہ مہدی کبوتروں سے کھیل رہا تھا، اسی دوران اس کے پاس

غیاث بن ابراہیم داخل ہوا، اس نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے مشہد حدیث ''لا سبق الا فی نصل أو حافر'' میں ''أو جناح'' کا لفظ بڑھادیا۔

مذکورہ اسباب کے علاوہ کچھ اور بھی اسباب تھے، جیسے متن اور سند کے اعتبار سے انوکھی حدیث پیش کرنے کے مقصد سے احادیث وضع کرتے تھے۔ فتوی کی تائید کے لئے، کسی متعین جماعت سے انتقام لینے کے لئے، لباس اور ماکولات ومشروبات میں سے کسی چیز کو رواج دینے کے لئے بھی بہت سی احادیث وضع کی گئیں۔

مذکورہ تفصیل سے وضاعین کی مندرجہ ذیل قسمیں ہمارے سامنے آئیں:

۱۔ زنادقہ

۲۔ بدعتی

۳۔ فرقۂ شعوبیہ

۴۔ متعصبین

۵۔ کسی فقہی مسلک کے حامی

۶۔ قصہ گو

۷۔ واعظ وصوفی

۸۔ سلاطین وامراء کے خوشامدی

۹۔ زبردستی کے محدثین جو علو سند اور انوکھی حدیثوں پر فخر کرنے کے لئے یہ کام کرتے تھے۔

آخر میں میں اپنے دل کی ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ وضع احادیث میں امراء وخلفاء کی تساہلی کا بھی بڑا دخل تھا، ایک طرح سے انہوں نے وضاعین کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی، اگر وہ ان پر شکنجہ کستے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی، ذرا سوچئے کہ غیاث بن ابراہیم خلیفہ مہدی کے سامنے جھوٹی حدیث بیان کرتا ہے اور وہ اسے یونہی آزاد چھوڑ دیتا ہے، اور کارروائی کرتا بھی ہے تو کبوتروں پر اور انہیں ذبح کرانے کا حکم دیتا ہے، کہ انھی کی وجہ سے حدیث وضع کی گئی تھی؛ لیکن خود واضع حدیث سے کچھ نہیں کہتا۔ اسی طرح ایک مرتبہ مقابل بن سلیمان بلخی نے مہدی سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لئے احادیث وضع کروں، تو خلیفہ نے بس انکار پر اکتفا کیا، اسے اس جرأت پر کوئی سزا نہ دی، بلکہ کسی طرح کی تادیب وتنبیہ بھی نہ کی۔ اسی طرح خلیفہ ہارون رشید کے سامنے اس کے قاضی ابوالبختری نے ایک حدیث وضع کی کہ رسول اللہ ﷺ کبوتر اڑایا کرتے تھے، تو اس نے اسے کسی طرح کی کوئی سزا نہ دی، صرف اتنا کہا کہ اگر تو قریش سے نہ ہوتا، تو میں تجھے معزول کر دیتا۔

لہذا اگر یہ روایات صحیح ہیں، تو خلفاء بھی اس سلسلے میں کم مجرم نہیں ہیں۔

رہی یہ بات کہ بعض خلفاء نے کچھ وضاعین کو قتل کرایا اور انہیں سزا بھی دی، تو دراصل اس کے پیچھے سبب یہ تھا کہ ان ہی لوگوں کو سزا دی جن سے انہیں اپنی حکومت کے بارے میں خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جن لوگوں سے انہیں اپنی حکومت کے بارے میں کوئی خطرہ نہیں تھا، ان پر انہوں نے کسی طرح کی کوئی کارروائی نہیں کی، حتی کہ قصہ گو واعظ، امراء وسلاطین کے سامنے مسجدوں اور عام محفلوں میں جھوٹی احادیث بیان کرتے تھے، لیکن کبھی ان پر لگام نہیں کسی گئی، وہ تو یہ کہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کا قلع قمع کرنے کے لئے بلند پایہ محدثین اور ائمہ وحفاظِ حدیث تیار کر دیے، جنہوں نے اس فتنہ کا سد باب کر دیا، ورنہ اگر وہ نہ ہوتے تو نہ معلوم یہ فتنہ کیا گل کھلاتا۔

اس فتنے کے مقابلے کے لئے محدثین نے جو خدمات وقربانیاں پیش کیں، ان کا تذکرہ آئندہ کسی مضمون میں ہوگا۔

☆☆☆

❑ عالم اسلام

ایک اہم دستاویز

ترجمہ: محمد عالم ندوی

یہ درحقیقت صہیونی لابی کے ساتھ امارات کے اشتراک کو ظاہر کرنے والی دستاویز ہے جس کو انگریزی سے عربی میں منتقل کیا گیا اور اب عربی سے اردو میں نقل کیا گیا، اس پر نظر ڈالنے سے دو باتیں صاف ہو جاتی ہیں، ایک یہ کہ امارات وسعودیہ پر اسرائیل کا مکمل کنٹرول ہے، دوسری یہ کہ امارات وسعودیہ کی حکومتیں صرف اور صرف صہیونیت کی اسلام دشمن پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ (ادارہ)

متحدہ عرب امارات کے سرکاری ماہرین کے ساتھ ڈیموکریٹک ایکسچینج کے دفاع کے لئے بی.ایف.ڈی کی میٹنگ کا مجوزہ ایجنڈا، جو اقوام متحدہ میں امارات کے مستقل سفیر یوسف العتیبہ کے ای میل ہیک ہونے سے عام ہوا۔

میٹنگ کا انعقاد ۱۱ر تا ۱۴ر مئی ۲۰۱۷ء کو ہوا۔

میٹنگ کے شرکاء:

۱۔ مارک دوبوتیز۔(چیف ایگزیکٹو آفیسر)

۲۔ جوناتھن شانزر (ریسرچ چیف ایگزیکٹو آفیسر)

۳۔ جان ھانا (سینئر مشیر)

متحدہ عرب امارات کے شرکاء:

خلدون مبارک۔ڈاکٹر انور قرقاش۔

اتوار کی شام: تعارفی نشست

پیر کا دن: قطر (موضوع نشست)

خطے کو غیر مستحکم کرنے میں قطر کی پالیسیوں کا ایک عام جائزہ

۱۔ دہشت گردی کو بڑھاوا دینے میں قطر ایک زبردست طاقت ثابت ہوا ہے۔

۲۔ قطر بنیاد پرست مسلمانوں کی حمایت کرتا ہے۔ جیسے الاخوان، القاعدہ۔شام اور لیبیا کی انتہاء پسند تنظیمیں جیسے حماس وغیرہ۔

۳۔ مصر،شام،لیبیا،خلیج کو غیر مستحکم کرنے میں قطر کا بڑا رول ہے۔

۴۔ خطے میں دہشت گردی کو پھیلانے اور اس کے امن کو ختم کرنے کے لیے الجزیرۃ چینل کام کر رہا ہے۔

قطر کے رویہ کو درست کرنے کے لئے امریکہ اور متحدہ عرب امارات کی سیاست اور رویہ پر مذاکرہ ہوا (جس کے اہم نکات یہ ہیں):

۱۔ قطری مفادات کو کم کیا جائے بالخصوص قطر پر امریکہ کے اعتماد کو کم کیا جائے اور مختلف طریقوں سے اس کا اظہار کیا جائے۔

۲۔ دہشت گردی کو قطر کے ساتھ جوڑا جائے۔

۳۔ قطر کو امن کا مخالف قرار دیا جائے اور اس پر اقتصادی اور سیاسی پابندیاں لگائی جائیں۔

۲۔ الاخون المسلمون۔ (موضوع نشست)

جس میں عالمی شناخت کی حامل اس جماعت اس تنظیم کا مشترک طور پر جائزہ لیا گیا اور اس کو ختم کرنے کے طریقوں پر بحث ہوئی۔

۱۔ عالمی سطح پر اس جماعت پر پابندی کے مضبوط طریقے اور

راستے تلاش کیئے جائیں۔

۲۔ وہ کون لوگ ہیں جن پر دہشت گردی کا لیبل لگا کر ان پر پابندی عائد کی جاسکتی ہے۔

۳۔ ان ہتھکنڈوں کا استعمال کیا جائے جو اس تنظیم کی قانونی حیثیت کو کم کر سکتے ہوں اور پابندی لگائی جاسکتی ہو۔

ترکی۔

ترکی میں واقع ہونے والے تغیرات پر مشترکہ طور پر نظر رکھی جائے۔

۱۔ اردگان کے صدارتی نظام کے نتائج پر نظر رکھی جائے۔

۲۔ اردگان کے عزائم اور خطے میں اس کے رول پر نظر رکھی جائے۔

۳۔ اردگان کی پالیسیوں اور اس کے اہداف میں اسلامیت کے رول پر نظر رکھی جائے۔

۴۔ مصر، شام، عراق، ایران، لیبیا، خلیج، اسرائیل، روس، اور یورپ کے حوالہ سے ترکی کی سیاسی پالیسیوں پر مذاکرہ ہوا، جس میں امارات و امریکہ نے ترکی کے رویے کو درست کرنے اور اس کو کنٹرول کرنے کے لئے سیاسی اقتصادی اور امن سے متعلق اسباب پر گفتگو کی۔

٤۔ سعودی

سعودی قیادت اور اس کی سیاست کا مشترکہ جائزہ۔

۱۔ ویژن ۲۰۳۰ء

۲۔ سعودی کی خارجہ اور دفاعی پالیسیوں اور دہشت گردی کے مقابلہ کا جائزہ لیا گیا۔

۳۔ سعودی قیادت کو خود شاہی خاندان میں درپیش چیلنجز اور سیاسی، اقتصادی اور مذہبی چیلنجز کا جائزہ لیا گیا۔

۴۔ امریکہ، چین اور روس کے ساتھ سعودیہ کے تعلقات نیز دیگر حکومتوں کے ساتھ اس کے رشتوں کا جائزہ لیا گیا۔

۵۔ عالمی دہشت گردی سے شریعت کو دور رکھنے میں سعودیہ کا کردار۔

سعودی رویہ کو لے کر امارات و امریکہ کی پالیسیوں کے بارے میں گفتگو ہوئی، اور اس کی تصحیح کے لیے سیاسی و اقتصادی اسباب پر غور ہوا۔

مصر، لیبیا، فلسطینی سیاست دانوں، عراق، اربیل، شام و عمان کے حالات اور وہاں کی حکومتوں کے بارے میں کھلے ماحول میں بحث ہوئی۔

منگل کا دن

سب سے پہلے ایران کی داخلی پالیسیوں پر بات ہوئی۔

۱۔ صدارتی انتخابات

۲۔ حکمراں، طاقتیں، جیسے خامنہ ای، پاسداران انقلاب، حسن روحانی پر گفتگو ہوئی۔

۳۔ اقتصادی صورتحال کا جائزہ لیا گیا۔

۴۔ سماجی صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔

۵۔ خامنہ ای کے بعد کون آئے گا۔

ایران کی داخلی پالیسیوں کو لے کر امریکہ اور امارات کی سیاسی، اقتصادی و امنی پالیسیوں پر غور و خوض کیا گیا۔

۲۔ دھشت گردی کی حمایت میں ایران کا کردار۔

۱۔ ایران کی صلاحیتوں، اہداف اور اسٹرٹیجی کا جائزہ لیا گیا۔

۲۔ یمن

۳۔ سوریا

۴۔ عراق

۵۔ لبنان وغیرہ کے بارے میں ایران کی سیاست اور اس کے مقاصد کا جائزہ لیا گیا۔

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نام کتاب: نقوش سیرت

مصنف: پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

صفحات: ۱۹۲

ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی 9313780743

نقوش سیرت میں اسوۂ حسنہ کا دلکش بیان ہے، سیرت رسول کی کشش و دلآویزی اس کی معنویت و اثر پذیری کو نئے انداز اور نئے لفظوں کا قالب دیا گیا ہے، سیرت کی حیثیت مسلّم اور اس کی معنویت تا قیامت باقی رہنے والی ہے، زمانہ محتاج ہے سیرت رسول کا، اس کی روشنی کے بغیر نہ معاش و معاشرت میں رنگ و نور نہ حکومت و سیاست سودمند، درحقیقت دنیا کو زندگی ہی ملی ہے سیرت رسول سے، اور یہ زندگی پر کیف و پر بہار و پرنور بھی سیرت کے پرتو سے ہی رہ سکتی ہے، زیر نظر کتاب میں سیرت کے مختلف گوشوں کا مطالعہ کیا گیا ہے، اس کو انسان کی عملی زندگی سے جوڑنے کی کوشش کی گئی، کتاب اگرچہ سات الگ الگ مقالات کا مجموعہ ہے لیکن سب کا مرکزی موضوع سیرت رسول ہے، اسی کا عکس ہے، اسی کا پرتو ہے، اسی کا نچوڑ ہے اسی کی تشریح ہے، سیرت کا کوئی ورق ہو، خواہ محض روایتی انداز میں ہی کسی واقعہ کو بیان کر دیا جائے تو بھی وہ عمل بڑا مبارک ہے، لیکن چونکہ مصنف گرامی بحر علم و تحقیق کے شناور ہیں اس لیے اس کتاب کے تمام مشتملات پر علمی رنگ حاوی ہے، بنیادی مآخذ و مصادر سے استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے سیرت کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کی ابتدا میں انھوں نے قرآن مجید کی تین منتخب آیات درج کی ہیں، یہ ابتدا بھی انوکھی ہے، اس میں یہ خاموش پیغام ہے کہ سیرت رسول ہی اصل میں تفسیر قرآنی ہے، قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے دنیا سنت و سیرت کی محتاج ہے، مذکورہ تین آیات میں سے پہلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کی رحمت للعالمینی کا تذکرہ ہے جس کو دنیا نے تقریباً فراموش کر رکھا ہے، رسول اللہ کا تعارف اس طرح کرایا ہی نہیں جاتا جیسے قرآن مجید نے کرایا ہے، قرآن نے تو آپ ﷺ کو سب کا رسول اور سب کے لیے رحمت قرار دیا ہے، دوسری آیت میں رسول کی زندگی کو اسوہ حسنہ قرار دینے کا تذکرہ ہے، اسوۂ حسنہ کی اس تعبیر سے سیرت کی اہمیت و معنویت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے دنیائے انسانیت کے لیے نمونہ قرار دیا، اور نمونہ کو حسن قرار دیا، اور حسن وہی ہے جس میں نقص نہ ہو، چنانچہ آپ کی سیرتِ طیبہ کمالِ حسن سے عبارت ہے، تیسری آیت میں اطاعت رسول کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے، ظاہر ہے کہ قرآن نے اطاعتِ رسول کو واجب قرار دیا ہے، اور بغیر آپ ﷺ کی اطاعت کے اطاعت الٰہی کا تصور ہی نہیں، اس معنیٰ خیز ابتدا کے بعد مصنف کا پیش لفظ ہے اور پھر بالترتیب سات مقالے ہیں۔

پہلے مقالے کا عنوان ہے ''علم کا تصور حدیث کی روشنی میں''، اس عنوان کے تحت مصنف نے علم، اس کی اہمیت، افادیت، قدر و منزلت، تصور علم کی وسعت و جامعیت، انواع و اقسام، مختلف وعلوم و فنون کو سیکھنے کی ترغیب و تحریک سے متعلق آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو خوبصورت تشریح کے ساتھ پیش کیا ہے، اس مقالے میں مصنف نے اس اہم نکتہ پر بھی بحث کی ہے کہ ''تمام علوم نافعہ کی تحصیل مطلوب ہے'' یہ نکتہ بھی آ ہی گیا ہے کہ علم کی تقسیم میں ''علم کی نافعیت و عدم نافعیت'' کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے، انھوں نے احادیث کی روشنی میں علم کو نفع بخش بنانے کے طریقے، علم کی اشاعت و ترقی پر بھی گفتگو کی ہے، دور حاضر میں علم کا تصور جس طرح بے جا تقسیم اور بے اعتدالی سے عبارت ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ مقالہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، جو علم کی جامعیت و نافعیت کی خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے، دوسرا مقالہ بھی دراصل علم و تعلیم سے ہی متعلق ہے، جس کا عنوان ''عہد نبوی کا نظام تعلیم'' ہے، اس مقالے میں تعلیم کی اہمیت پر گفتگو کی گئی ہے، پھر عہد نبوی میں اس کے ذرائع اور طریقے بیان کیے گئے ہیں، آپ ﷺ کے منہج تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے،

اس مقالے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تعلیم کے جو طریقے استعمال کیے وہ کس قدر مثالی اور قابل تقلید تھے کہ آج بھی دنیا ان سے اعراض نہیں کر پائی ہے، اس موضوع پر مختلف لوگوں نے لکھا ہے مگر مصنف گرامی نے انتہائی سادہ اسلوب، مرتب انداز میں عہد نبوی کے مراکز تعلیم، انواع تعلیم، طریقۂ تعلیم اور تدریس کے مناہج کو پیش کیا ہے۔

تیسرا مقالہ ''آداب معاشرت قرآن وسنت کی روشنی میں'' کے عنوان سے درج ہے، اس دور انتشار اور مادی تہذیب کے عہد میں یہ موضوع انتہائی اہمیت کا حامل ہے، ظاہر ہے قرآن مجید نے صرف انسان کے معاد کی فکر نہیں کی ہے، بلکہ اس کی معاشی اور معاشرتی رہنمائی بھی کی ہے، قرآن مجید میں جا بجا اس کی تعلیم وتلقین ہے اور سورہ نور وسورہ حجرات میں تو خاص طور پر معاشرت سے متعلق مضامین بیان کیے گئے ہیں، آنحضرت ﷺ کی زندگی دیکھیے تو وہ ان مضامین کی شرح نظر آتی ہے، اس مقالہ میں قرآنی آیات اور احادیث نبویہ نیز نبی اکرم ﷺ کے معمولات کی روشنی میں معاشرت کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن کو اگر عملی زندگی کا حصہ بنایا جائے تو خانگی زندگی گلزار ہو جائے اور معاشرہ مہکتے پھولوں سے بھرا پُرا گلشن نظر آئے۔ اس کے بعد چوتھا مقالہ بھی آپ ﷺ کی معاشرتی زندگی سے ہی متعلق ہے، جس میں گزشتہ مضمون کے علاوہ دیگر پہلوؤں پر سیرت کی رہنمائی پیش کی گئی ہے، خانگی امور میں آنحضرت کس طرح نگہداشت فرماتے، اجتماعی امور میں کس طرح ہاتھ بٹاتے، گھر والوں کی کیسے تربیت فرماتے، کس طرح حاجت روائی، اعانت اور تعاون کرتے، مریضوں سے کیسے ملتے، مہمانوں کی خاطر داری اور دوسروں کا احترام کس طرح کرتے، یہ اور اس طرح کے بعض دوسرے اہم مباحث اس مقالہ میں زیر بحث آئے ہیں، ان سب کا اسلوب علمی تو ہے ہی مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے ''نقوش سیرت'' میں واقعی سیرتِ رسول ﷺ کے اہم وغالب پہلو یعنی آپ ﷺ کی داعیانہ حیثیت کو اس کتاب کے علمی اسلوب میں باہم آمیز کر دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ سیرت کے ان پہلوؤں کو اگر برتا جائے تو معاشرے کی بے شمار الجھنیں خود بخود کافور ہو جائیں۔

پانچویں مقالے میں آنحضرت ﷺ کے مکی عہد کو سامنے رکھ کر آپ ﷺ کی معاشی زندگی کا مطالعہ کیا گیا ہے، آپ ﷺ کے گھر میں کھانے پینے کا نظم، آپ کی تاجرانہ زندگی، آپ کی خوئے وفا، حسن معاملہ اور جود وسخا کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے، اس کے بعد کا مقالہ خطبہ حجۃ الوداع سے متعلق ہے، جس میں حقوق انسانی سے متعلق نکات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور مدلل انداز میں بتایا گیا ہے کہ یہ حقوق انسانی کا اولین چارٹر ہے جس کی کوئی نظیر تاریخ انسانی میں دستیاب نہیں، اس حوالے سے اس خطبہ پر بہت کام کیا گیا ہے اور مختلف اصحاب قلم نے اس خطبہ کو اپنا موضوع بنایا ہے، ڈاکٹر صاحب نے متعدد کتابوں کا تذکرہ کیا ہے اور اس سلسلے کی راقم کے نزدیک سب سے بہترین کتاب ''خطبۃ الوداع حقوق انسانی کا عالمی منشور'' مصنفہ ڈاکٹر نثار احمد کے امتیازات کو بھی بیان کیا ہے، اس مقالے میں متعدد ذیلی مباحث بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن پر مصنف نے اختصار وجامعیت کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

اس کتاب کا آخری مقالہ سیرت نبوی پر ایک کتاب کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے، مصنف نے مولانا سید جلال الدین عمری صاحب کی کتاب ''اوراق سیرت'' کے مشتملات پر تجزیاتی گفتگو کی ہے، بہر حال راقم کی نظر میں ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی کی یہ کتاب اگر چہ سیرت پر کوئی روایتی اور باضابطہ تصنیف نہیں مگر اس کی علمی ودعوتی حیثیت مسلّم بلکہ ممتاز ہے، اس کا اسلوب تجزیاتی اور تفہیمی ہے، اس کی نافعیت میں کوئی کلام نہیں، اس سے عام پڑھا لکھا شخص بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اہل علم اس میں درج مباحث کو اپنے لیے مزید موضوع بحث وتحقیق بنا سکتے ہیں، کتاب اپنے مندرجات ومباحث اور اسلوب وطباعت نیز سب سے بڑھ کے اپنے موضوع ومواد کے باعث نہ صرف یہ کہ قابل استفادہ ہے بلکہ امید ہے کہ اس کا افادہ عام ہوگا وراس سے گھر گھر فائدہ اٹھایا جائے گا، کیوں کہ اس میں بعض ان پہلوؤں کو نہایت آسان انداز میں موضوع گفتگو بنایا گیا ہے جن سے عام طور پر اہل علم اعراض کرتے ہیں یا محض روایتی انداز میں بیان کر جاتے ہیں۔

☆☆☆

آخری صفحہ

یہی انسان کی فلاح کا ضامن ہے

(م۔ق۔ن)

ایک صاحب دل اور عارف زمانہ بزرگ نے ایک موقع پر اسلام میں کسب معاش کی اہمیت کو بتاتے ہوئے اپنے مریدوں اور مسترشدوں کو ایسی گرہ کی بات بتائی کہ دل چاہتا ہے کہ ان کے قول کو بار بار پڑھا جائے اور دل میں اتارا جائے، بزرگ نے فرمایا:

''اگر تمہارے پاس اس قدر بے شمار دولت یا مستقل ذرائع آمدنی ہوں جو تمہاری پشت در پشت بلکہ قیامت تک کے لئے کافی ہوں تو بھی تمہیں کم از کم آٹھ گھنٹے روز کام کرنا چاہیے، اپنے لئے نہیں بلکہ نظام دنیا قائم رکھنے کے لئے کیوں کہ کارخانۂ قدرت کی اس عظیم الشان مشنری میں تمہارا وجود بھی ایک پرزے کی حیثیت رکھتا ہے، اگر یہ پرزہ مشین سے خارج ہوجائے تو لازماً اس کا اخراج دسرے پرزوں پر بوجھ ڈالے گا اور ان کے انتشار پر اثر انداز ہوگا، نظام فلکی بھی اپنی باقاعدہ کار گردگی ہی سے اپنی صحیح رفتار پر تا قیامت قائم رہے گا، نظام ارضی کی اسی نیے کاری اور بے قاعدگی نے عام عالم کو زیروزبر اور تہہ وبالا کر رکھا ہے۔

حضرت نافع بن خدیج سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب ایک صحابیؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! سب سے زیادہ پاک اور اچھی کمائی کون سی ہے؟ تو حضور ﷺ نے جواب دیا'' آدمی کا اپنے کا ہاتھ سے کام کرنا اور وہ تجارت جس میں تاجر بے ایمانی اور جھوٹ سے بچتا ہے۔

اسلام نے تعلیم دی ہے کہ آدمی کو اپنی روزی حلال طریقوں سے کمانی چاہیے کہ یہ روزی آزادانہ طریقہ پر کمائی جائے، دوسروں کی غلامی اور چاکری سے بہتر ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ کی کمائی کھائے نیز یہ کمائی حلال ہو، ناجائز طریقہ سے حاصل نہ کی جائے۔

قوت بازو سے روزی پیدا کرنا اسلام کی نظر میں کس قدر مطلوب ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ پھاوڑا چلاتے چلاتے ایک صحابیؓ کے ہاتھ سیاہ ہوگئے تھے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو پوچھا کہ تمہارے ہاتھ پر کچھ لکھا ہے صحابیؓ نے جواب دیا ''نہیں'' پتھر پر پھاوڑا چلاتا ہوں اور اس سے اپنے بال بچوں کے لئے روزی پیدا کرتا ہوں، یہ سن کر آپ ﷺ نے خوشی سے ان صحابی کا ہاتھ چوم لیا اور رزق کی برکت کی دعائیں دیں''۔

البتہ خیال رزق کے کسی مرحلہ میں بھی انسان کو خیالِ رازق سے غافل نہیں ہونا چاہیے تاکہ مومن کی معاشی سرگرمیوں اور دوسروں کی معاشی سرگرمیوں میں فرق معلوم ہو۔

اسی لئے احادیث میں تاجر کو خوفِ خدا اور ایمان داری برتنے کی خصوصی تلقین کی گئی ہے۔

الغرض اسلام میں دوسروں کے مال اور جیب پر نظر رکھنے کے بجائے خود اپنے ہاتھ سے کمانے اور محنت ومزدوری کرنے کی تاکید کی گئی ہے کہ یہی انسان کی فلاح کا ضامن ہے۔

☆☆☆